UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222097
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

صرف یہ ایڈیشن نراین دت سہگل اینڈ سنز لاہور کی خاص اجازت سے
شائع کیا جارہا ہے

اُس کی کہانی

پرویز

Checked 1978

رائل ایجوکیشنل بک ڈپو
اُردو بازار دہلی

بار دوم　　(جید برقی پریس دہلی)　　قیمت عہ؍

انتساب

جیوتی۔ سرجیت۔ ارملا۔ کرشنا۔ شانتی۔ کنتی۔ ساوتری
ناہید۔ سمرتا۔ دِبینی اور سمتری کے نام:۔

پرویز

سول ایجنٹس

نراین دت سہگل اینڈ سنز

تاجران کتب۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور

پیش لفظ

اس داستانِ حیات کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا مقصد میرے لئے محض اس داستان کی دلچسپی ہے۔ اور داستان کے ہیرو کیلئے ایک یادگار چھوڑنا ـــــ داستان کا ہیرو چونکہ ابھی عین عالمِ شباب میں ہے۔ اور دوسرے کردار بھی جو اس داستان کی جان ہیں قریب قریب زندہ ہیں۔ اسلئے نام و مقام سب تبدیل کر دئے گئے ہیں۔ کچھ اسلئے بھی کہ ان کے الم نشرح ہو جانے پر کئی ایک متمول گھرانوں کی خاندانی وجاہت کے خاک میں مل جانے کا خدشہ تھا۔ قطع نظر اس کے کہ داستان کے ہیرو کی مجلسی و ازدواجی زندگی کی تن آسانیاں مخدوش ہو جائیں۔ اس لئے اس داستان کو کسی خاص فرد سے منسوب کرنے سے پہلے میں ناظرین پر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ نام و مقام کے فریب میں نہ آئیں۔ کیونکہ وہ سر بسر بے بنیاد ہیں۔ اس پر بھی اگر وہ نہ رہ سکیں۔ تو پھر یہ روگ میرے بس کا نہیں۔

ایک بات اور جسے میں داستان سے پہلے واضح کر دینا چاہتا ہوں یہ ہے کہ چونکہ یہ داستانِ حیات ہے۔ اور قدرت ایک افسانہ نگار واقع نہیں ہوئی۔ جو داستان کی تمام کڑیوں کو باہم ملاتی چلی جائے۔ اس لئے اس کتاب کے پڑھنے والے تسلسل کی جستجو نہ کریں۔

ہاں۔ اگر وہ زندگی کی برہنہ تلخیوں سے دوچار ہونا چاہتے ہیں تو یقیناً یہ کتاب ان کے لئے ایک ایسا مواد پیش کرے گی۔ جو ان کی زندگی کے بھولے بھٹکے خوابوں کو رنگین صورت بخش دے گا ـــــ آپ اسے ایک زندہ تصویر پائیں گے۔ "فقط"

پرویز

پہلگام
۲۳ ستمبر ۱۹۴۳ء

جوانی کی مسلسل تلخیوں میں

کوئی میٹھے سروں میں گا رہا ہے

پرویز

آغاز

وہ میرا جانی ہے۔ اس کا کوئی بھی راز مجھ سے پوشیدہ نہیں یہاں تک کہ اگر راہ چلتے ہیں اس کی آنکھوں میں تنکا بھی پڑا۔ تو اس نے مجھے بتلا دیا۔ لیکن عموماً اس کی آنکھوں میں تنکے نہیں پڑا کرتے۔ دل میں کانٹے چبھا کرتے ہیں جن کی خلش سنسان راتوں کی سردمہری کے باوجود اس کی روح کو تمازت بخشتی رہتی ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے لئے خوابوں کی سرزمین میں نت نئے محل تعمیر کرتا رہتا ہے۔ وہ اس قدر حساس واقع ہوا ہے۔ کہ دوسرے کے کندھوں پر تنکا بھی اس سے برداشت نہیں ہو سکتا لیکن اپنے سر پر پہاڑ گر پڑنے پر بھی وہ تحمل کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ بارہا عشرت کا لبریز جام اس کے ہاتھوں میں دیا گیا۔ لیکن اس کے حساس ہاتھوں سے لبوں تک پہنچتے پہنچتے چھوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ اس کی کامران راتوں میں بھی ناکامیاں کروٹیں لیتی ہیں۔ اس کے مسرور ترین اوقات میں بھی مایوسی کا عنصر موجود ہوتا ہے ان سب باتوں کے باوجود بلاشبہ وہ ایک دلچسپ انسان ہے۔ اور مجھے

یقین ہے کہ ان اوراق کو پڑھ لینے کے بعد آپ اپنے دل کی گہرائیوں میں اس کے لئے ہمدردی محسوس کریں گے - یہ میرا اپنا خیال ہے - ممکن ہے، آپ نہ کریں - اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے آپ کی ہمدردی کا محتاج ہی نہ ہو ——————————

پہلا باب

وہ میرا چچا زاد بھائی ہے۔ ہم بچپن میں اکٹھے کھیلتے تھے۔ اور ہمارا محبوب کھیل تھا "شیر شیر" یہ ایک نہایت ہی سادہ سا کھیل ہے اس کھیل میں ایک لڑکا شیر بنتا ہے۔ اور باقی سب مسافر۔ اب جو لڑکا شیر بنتا ہے وہ ایک خاص مقام کو جسے منزل کہتے ہیں چھو کر آتا ہے۔ اتنے میں سب لڑکے تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکا ہر ایک کی تلاش کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال کرتا ہے کہ اس مقام تک جسے منزل مقرر کیا گیا ہے۔ کوئی نہ پہنچے۔ اب چھپے ہوئے لڑکوں میں ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ جلد سے جلد منزل تک پہنچ جائے۔ کیونکہ جو لڑکا سب سے پہلے منزل پر پہنچ جائے وہی دوسری دفعہ شیر بننے کا حقدار ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اپنی اس کوشش میں پکڑا جائے تو پھر وہ شیر کے رحم پر ہوتا ہے۔ چاہے دانتوں سے کاٹے۔ چاہے پنجوں میں دبوچ کر خوب جھنجھوڑے۔

خیر یہ تو تھا وہ ننھا سا بے ضرر کھیل اور اُسے کھیلنے والے ہوتے تھے عموماً ہم پانچ ایک تو وہ ! - آپ یقیناً اس کا نام جاننا چاہیں گے لیکن سچی بات تو یہ ہے - کہ میں اس کا صحیح نام بتا نہیں سکتا - اس لئے جہاں تک اس داستان کا تعلق ہے - آپ فرض کر لیجئے اس کا نام "سمرندر" ہے - تو خیر ایک تو تھا وہ - دوسرا میں خود - تیسرا حوالدار کا لڑکا بالمکند - چوتھا نانک - اور پانچواں یا پانچویں چیف کلرک بابو جب رام کی لڑکی جیوتی - میں ان سب میں بڑا تھا - اور میری عمر اس وقت بارہ سال سے کچھ ہی زائد تھی - اس لئے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باقی لڑکوں کی عمر کیا ہوگی - ہاں یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے - کہ وہ ان دنوں صرف نو سال کا تھا - کیونکہ چند یوم پیشتر اس کی برسی منائی گئی تھی - اور اس موقع پر اس نے مجھے بہت سے گلاب جامن چرا چرا کر کھلائے تھے - بابو جب رام کی لڑکی جیوتی کی عمر بھی کچھ اس کے لگ بھگ ہی تھی -

یہ عجیب بات تھی کہ جب بھی ہم کھیلنے کے لئے اکٹھے ہوئے - اور شبیر شبیر کھیلنا قرار پایا - سب سے پہلے وہی شبیر بنا - اس لئے نہیں کہ اس کے والد ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے - کیونکہ بچوں میں خصوصاً اس عمر کے بچوں میں یہ امتیاز ہوتا ہی نہیں - اور نہ ہی اس لئے کہ وہ ہم سب سے زبردست تھا - کیونکہ وہ زبردست تھا ہی نہیں - وہ تو ایک نہایت ہی نرم و نازک خوبصورت لڑکا تھا جس کے چہرے سے سادگی و بھولا پن اس شدت سے مترشح تھے - کہ اب جب میں سوچتا ہوں تو بار بار یہ خیال آتا ہے کہ اس وقت اگر کوئی یونانی راہب اُسے دیکھ لیتا تو یقیناً اُسے دیوتا بنانے کے لئے اٹھا لے جاتا - کیوپڈ کو اگر اندھا نہ ظاہر کیا گیا ہوتا - تو میں سمجھتا کہ شاید سمرندر کے لباس میں کیوپڈ

ہی ذہن پر اُتر آیا ہے ۔ اور اب دیکھئے کس کس کا دل چھیدتا ہے ۔ کیوپڈ بچارے کو نابینا ہونے کے باعث تیروں کا محتاج ہونا پڑا ۔ لیکن سرندر کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں بجلیاں کروٹیں لیتی تھیں ۔ خدا کی پناہ ! اُن کی زد سے بچ نکلنا کسی کا کام نہ تھا ۔ اس وقت بھی اس کی نگاہوں میں اتنا ہی عمق تھا جتنا کہ اب ۔ اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ۔ کہ کیا اس وقت بھی ان نگاہوں کے پس پردہ ایک ایسا ہی تلاطم بپا تھا جیسا کہ اب ۔ اور کیا تب بھی ان کی زبان کو سمجھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ آج ؟

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اُسے ہم سب پر کچھ ایسی فوقیت حاصل تھی ۔ کہ جب کھیل شروع ہوتے ہی وہ کہتا " سب سے پہلے میں شیر بنوں گا " تو سب جھٹ مان جاتے ۔ گویا یہ اس کا پیدائشی حق تھا ۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ بیحد حساس واقع ہوا تھا ۔ یہاں تک کہ اگر تنکا بھی اس کی مرضی کے خلاف اڑتا تو جب تک وہ اسے واپس اس کی جگہ پر نہ رکھ لیتا اسے چین نہ آتا ۔ اس لئے کوئی بھی اس معمولی سی بات کے لئے اُسے برہم کرنا نہ چاہتا تھا ۔ مجھے اُن ہی دنوں کا ایک واقعہ یاد ہے ۔ سکول میں چھٹی ہوئی ۔ ہم سب جزدان سنبھالنے لگے ۔ وہ جھٹ پٹ جزدان بغل میں داب دروازہ کی جانب لپکا ۔ لیکن اس کے دروازہ تک پہنچتے پہنچتے دو لڑکے کمرے سے باہر نکل گئے اور کچھ نکلنے ہی والے تھے کہ اس نے ان سب کو روکتے ہوئے پہلے دو لڑکوں کو بھی پکارا ۔ اور جب وہ کمرہ میں آ گئے تو خود کھٹ سے باہر ہو گیا ۔ پوچھنے پر صرف اتنا کہا کہ پہلے مجھے باہر نکلنا تھا ۔ کیوں ؟ تو اس کا جواب نہ اس کے پاس تھا ۔ نہ وہ دے سکا ۔ خیر بات معمولی تھی ۔ آئی گئی ہو گئی لیکن اب جب میں ان جزئیات کو لیکر اس کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کرتا ہوں تو

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس کیرکٹر کی حِس کا مظہر سرِ دست اب ہے۔ آج سے برسوں پہلے داغ بیل رکھی جا چکی ہے۔

نمبر بنتے ہی جب وہ دزدیدہ نگاہوں سے کھلاڑیوں کی جانب دیکھتا۔ منزل کو ہاتھ لگا کر ان کے پیچھے بھاگتا تو اس کا رُخ ہمیشہ اس جانب ہوتا جدھر جیونی چھپی ہوئی ہوتی اور گو اس دوران میں سب کھلاڑی منزل کو چھو لیتے۔ لیکن وہ جیونی کو جہاں بھی وہ ہوتی ڈھونڈ نکالتا۔ اور پھر ہاتھوں میں پکڑ کر جھنجھوڑتا۔ اور دانتوں سے کاٹتا۔ خیر دانتوں سے کاٹنا تو برائے نام ہی ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہونٹوں سے کاٹتا تھا۔

یہ تھی اس کھیل کی ابتدا اور انتہا۔ اور اب بیس برس گذر جانے کے بعد بھی جب مجھے اس کی یاد آتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اس کا صنفِ نازک کی طرف ابتداء سے یہ رجحان۔ کیا اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ کیا جس وقت وہ ننھی جیونی کو ہاتھوں میں لیکر جھنجھوڑتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے دل میں جذبات کا تلاطم بپا ہوتا تھا۔ اور اس کے حواس اس سے لذت محسوس کرتے تھے۔ یقیناً کرتے ہوں گے۔ ورنہ وہ کیوں باقی سب کھلاڑیوں کو چھوڑ کر صرف جیونی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگا کرتا۔ ممکن ہے حواس کی وہ لذت اس لذت سے مختلف ہو۔ جو ایک جوان مرد ایک جوان عورت کو اپنے بازوؤں میں لیکر محسوس کرتا ہے۔ اور ایسا ہونا اغلب ہے۔ بہرحال وہ لذت ضرور محسوس کرتا تھا۔ خواہ وہ کسی نوع کی تھی۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے۔ کاش ہم سب پھر ایک جگہ اکٹھے ہو سکیں اور اس عمر میں پھر ایک بار شیر شیر کھیلیں۔ پھر میں دیکھوں کہ کیا وہ اب بھی جیونی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا ہے۔ اگر بھاگتا ہے تو اس کا بھاگنا

کیا اب بھی اسی طرح بیباکانہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ ڈر بھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر اب اس شیر کو جیوتی کے پیچھے کھلا چھوڑ دیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ اس غریب لڑکی کو نگل ہی جائے۔ جسمانی طور پر نہ سہی روحانی طور پر سہی۔

کتنی ہی مدت ہم یہ کھیل کھیلتے رہے۔ فرسودہ ہو جانے کے باوجود اس کھیل میں اب بھی ہمارے لئے اتنی ہی کشش تھی۔ اور اب بھی ہم سب کام چھوڑ کر شیر شیر کھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ نہ معلوم یہ کھیل کب تک جاری رہتا۔ کہ ایکا ایکی اس کے والد کا تبادلہ پشاور ہو گیا۔ سامان سب پہلے بک کروا کر بھیج دیا گیا۔ صرف چند ضروری اشیاء رکھ لی گئیں۔ جس دن ہم سب کو جانا تھا سرندر نے نئی پوشاک پہن رکھی تھی۔ ہمارے سب ساتھی ہمارے گرد جمع تھے اور سرندر ان سب سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے بچھڑنے کے کوئی آثار اس کے چہرہ سے ہویدا نہ تھے۔ بالمکند کے استفسار کرنے پر کہ پشاور کتنا بڑا ہے۔ اس نے جس انداز میں جواب دیا۔ اس سے واضح طور پر یہ عیاں ہوتا تھا کہ وہ پشاور پر نادیدہ طور سے عاشق ہو چکا ہے۔ اور اب اس کی برتری و عظمت کا سکہ اپنے ساتھیوں پر جمانا چاہتا ہے۔ شاید اس جواب میں کوئی عنصر اپنی برتری ظاہر کرنے کا بھی پوشیدہ ہو۔ بہرحال اس وقت میں اُسے سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس نے ایک خود پسندانہ مسکراہٹ چہرہ پر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"جی ایسے ایسے پچاس قصبے اس میں سے نکلتے ہیں!"

"تب تو وہاں اس سے بڑی بڑی حویلیاں بھی ہوں گی؟ نانھو نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

جی۔ ایسے ایسے بیڈول مکان تو اسی قصبے میں بنتے ہیں۔ پتاجی کہتے

ہیں۔ وہاں ہم ایک عالی شان بنگلہ میں رہیں گے

"اچھا" جیوتی نے حیران ہوتے ہوئے کہا

"ہاں جی" اس نے جیوتی کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے اضافہ کیا "اور پہلے دن ہماری روٹی تحصیلدار کے گھر ہوگی۔"

یہ میں اس وقت بھی جانتا تھا۔ اور بعد ازاں اس کی تصدیق بھی ہو گئی کہ اس وقت اس کا تحصیلدار کے گھر روٹی کا ذکر کرنا محض اپنے ساتھیوں کو مرعوب کرنے کیلئے تھا۔ کیونکہ اس میں اصلیت نام کو بھی نہ تھی۔ اس نے اپنے والد سے کہیں سن لیا تھا کہ پشاور میں ان کا بنگلہ کسی تحصیلدار کے بنگلہ سے ملحق ہے۔ بس اس نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ پہلے دن انہیں تحصیلدار کے ہاں کھانا ہوگا۔ لیکن مجھے حیرت تھی تو اس بات کی کہ یوں مرعوب کرنے والا انداز اختیار کرنے کے باوجود وہ جیوتی سے بیگانگی برتنے سے قاصر تھا۔ ورنہ اس کے گال پر چٹکی لینا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنا۔ اور ان سب سے بڑھ کر جاتی دفعہ خصوصاً اسے تصویروں کی ایک بڑی کتاب دینا۔ اور اس کے پہلے ورق پر اپنے نام کے ساتھ جیوتی کا نام لکھنا۔ کیا یہ سب باتیں بے معنی تھیں۔ اس وقت گو ان باتوں کی میری نظر میں کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ لیکن اب جب میں ان باتوں کو اس کے کردار کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جن پر اس کے کردار نے تعمیر پائی۔

پشاور آ کر ہم پر سب سے پہلے اس امر کا انکشاف ہوا کہ جس بنگلہ میں سرندر کے والد نے قیام پذیر ہونا تجویز کیا تھا۔ وہ بذاتِ خود ایک بڑے بنگلہ کا نصف حصہ تھا۔ اور بقایا نصف حصہ میں ایک سردار صاحب جو کبھی تحصیلدار

تھے۔ اور آپ قفط مالدار تھے۔ رہائش رکھتے تھے۔ یہ بنگلہ دراصل ان ہی کی ملکیت تھا۔ اور چونکہ ان کی ضروریات سے بہت زیادہ تھا اسلئے انھوں نے اس کا نصف حصہ کرایہ پر اٹھا دینا مناسب خیال کیا۔ سرندر کے والد اس کے پہلے کرایہ دار تھے۔ چند یوم تو یونہی سامان کو ترتیب دینے میں صرف ہوگئے پھر جب یہ ہماہمی قدرے کم ہوئی تو ہم نے تحصیلدار صاحب کے بنگلہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے اور ہمارے بنگلہ میں کوئی فرق ہے تو ایک گراموفون کا۔ ان دنوں گراموفون ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ اب تو ہر گلی کوچے میں جگہ بجگہ ریڈیو چیخ رہے ہیں۔ لیکن ان دنوں گراموفون بھی شاذ شاذ گھرانوں میں نظر آتے تھے۔ ان تحصیلدار صاحب کے ہاں ایک دلکش گراموفون تھا جسے عموماً ان کی جوان سال لڑکی سرجیت کور بجایا کرتی تھی۔ سرجیت ایک نہایت ہی پیاری پندرہ سالہ لڑکی تھی۔ شاید وہ اس لئے ہمیں بہت پیاری نظر آتی تھی۔ کیونکہ وہ رنگا رنگ کی دلفریب ساڑھیاں پہنا کرتی تھی۔ یا شاید اس لئے کہ ہمیشہ ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے چہرہ پر کھیلا کرتی تھی۔ وہ بہت جلد ماں جی (سرندر کی ماں) سے گھل مل گئی۔ پھر تو وہ اکثر ہمارے ہی ڈرائینگ روم میں گراموفون اٹھا لایا کرتی اور کتنی کتنی دیر بجایا کرتی۔ اس وقت ہم سب اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور وہ نہایت پیار سے ہمیں اپنے پاس کوچ پر بٹھا لیا کرتی تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ سرندر کو اپنے پاس کوچ پر بٹھا لیا کرتی تھی اور مجھے سریندر کے پہلو میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ان دنوں یہ ریکارڈ نیا نیا چلا تھا اور بہت مقبول ہوا تھا۔۔۔

چھوٹی بڑی سوئیاں ری جالی کا مورا کا ڑھنا

ایک دن جب ہم سکول سے واپس آئے تھے تو ہمارے ڈرائنگ روم

میں گراموفون بج رہا تھا۔ ہم اپنے پڑھنے کے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھے ڈرائینگ روم میں چلے گئے۔ اور سریندر نے سرجیت کے قریب جا کر کہا

"وہ ریکارڈ بجاؤ نا جیت جی"

"کونسا"

"وہ ـــ چھوٹی بڑی شوئیاں . . . . ."

سریندر کی عمر اس وقت دس اور گیارہ سال کے درمیان تھی لیکن وہ ابھی تک عموماً س کو ش ہی کہتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ وہ س کہہ ہی نہ سکتا تھا اس کا جی چاہے تو وہ صاف طور پر س کہہ سکتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ شروع سے ہی لاڈلا چلا آیا تھا اور ماں کو اس کی توتلی باتیں از حد پسند تھیں۔ اسلئے وہ جان بوجھ کر س کو ش ہی کہا کرتا تھا۔ اور اب تو یہ ایک قسم کی اس کی عادت ہی ہو گئی تھی۔ آپ اسے زبان کا نقص کہہ لیجئے۔ بہر حال میں تو اسے وصف کہوں گا۔ کیونکہ اگر اس کی زبان میں یہ وصف نہ ہوتا تو شاید میں یہ واقعہ یہاں بیان کرنا ضروری خیال نہ کرتا۔ ہاں تو جب اس نے کہا۔

"چھوٹی بڑی شوئیاں" تو سرجیت نے پیار سے اس کا منہ اوپر اٹھا کر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس نے سنا ہی نہیں۔ دوبارہ پوچھا

"کونسا"

سریندر نے پھر اسی انداز میں جواب دیا۔

"چھوٹی بڑی شوئیاں ری"

سرجیت کو اس کے س کو ش کہنے کا انداز کچھ اس قدر پسند آیا کہ اس نے جھک کر پیار سے سریندر کا منہ چوم لیا۔ اس وقت سریندر کی ماں بھی کمرہ میں کھڑی تھی۔ اس نے سرجیت کو بتایا کہ سریندر شروع سے

لاڈلا رہا ہے اور ابھی تک سن کو شن ہی کہتا ہے۔ سرجیت نے ریکارڈ تبدیل کرنے سے پہلے ایک بار پھر سریندر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کہو سوئیاں"

اور جب پھر سریندر نے سوئیاں کو شوئیاں کہا۔ تو وہ اس قدر مسرور ہوئی کہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

چند دن گزر گئے۔ اب سرجیت کا معمول تھا کہ وہ تب تک چھوٹی بڑی سوئیاں کا ریکارڈ نہ لگاتی۔ جب تک سریندر اسے بجانے کو نہ کہتا۔ اور وہ بھی تب جب سریندر دو تین بار سوئیاں کو شوئیاں نہ کہہ لیتا۔ سریندر کے شوئیاں کہنے پر وہ ہر بار کھلکھلا کر ہنستی۔ نہ معلوم اُسے اس لفظ میں کون ہنسی کا خزانہ مل گیا تھا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی تھی

سریندر کو ٹماٹروں کا بیحد شوق تھا۔ اس نے چند ہی یوم میں اپنے باغ کے سب ٹماٹر ہضم کر دیئے۔ اور اب گزشتہ کئی دنوں سے سردار صاحب کے ٹماٹروں پر نظر رکھتا تھا۔ جب بھی وہ ان ٹماٹروں کے پودوں کے قریب سے گزرتا۔ ان کی زردی مائل سرخی اسے دعوتِ نشاط دیتی محسوس ہوتی۔ اور اس کے منہ میں پانی بھر آتا۔ لیکن یہ شاید سردار صاحب کے سابقہ تحصیلدار ہونے کا خوف تھا۔ جو اب تک اُسے ٹماٹروں کی خوشہ چینی سے روک رہا تھا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے ان معاملوں میں اس کی جسارتیں ہمیشہ ضرب المثل رہی ہیں۔ میں بھی حیران تھا اور سوچتا تھا کہ دیکھیں یہ ٹماٹر کب تک اپنی خیر مناتے ہیں کہ ایک دن ایک عجیب ہی واقعہ رو نما ہوا۔ وہ ٹماٹروں کی دھن میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا سردار صاحب کے باغ کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اُسے سرجیت کے کمرہ سے گراموفون بجنے کی آواز آئی۔ اس پر طرفہ یہ کہ

اس کا دلپسند ریکارڈ بج رہا تھا" چھوٹی بڑی سوئیاں ری" وہ ٹھاکر جی را نا تو بھول گیا ۔ دبے پاؤں چلتا ہوا سرجیت کے کمرہ کے قریب پہنچ گیا ۔ اس میں شک نہیں کہ سرجیت اب ہم سب سے اچھی طرح گھل مل گئی تھی ۔ تاہم ہمیں ان کے بنگلہ میں جانے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا ۔ اس لئے ایک فطری جھجک بنگلہ میں داخل ہونے کی اب بھی سریندر میں موجود تھی ۔ اور وہ بجائے اس کے کہ کمرہ میں داخل ہوکر سیدھا سرجیت کے پہلو میں کھڑا ہو جاتا ۔ دروازہ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا ۔ معاً سرجیت کی نگاہ اس پر پڑی ۔ اس کے ساتھ ہی ایک شوخ مسکراہٹ اس کے چہرہ پر کھل اٹھی ۔ اس نے کھٹ سے گراموفون بند کر دیا ۔ اور سریندر کو اپنے قریب بلاتے ہوئے کہا ۔

" ارے سریندر ـــــ وہاں کیوں کھڑے ہو اندر آجاؤ "

اور سریندر آہستہ آہستہ گردن لٹکائے سرجیت کے پاس پہنچ گیا ۔

" وہاں کیوں کھڑے ہو گئے تھے " سرجیت نے سریندر کی ٹھوڑی اٹھاکر اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے کہا

" یونہی " ـــــ اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا ۔

" اچھا بیٹھ جاؤ " سرجیت نے اسے کوچ پر بٹھاتے ہوئے کہا ۔

" باجا سنو گے ؟ "

" جی "

" کون سا ریکارڈ بجاؤں "

" وہی "

" وہی کونسا "

" وہی جو ہے "

"وہی" سرجیت نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کا کوئی نام نہیں"۔
"میں نہیں بتاؤں گا" سریندر نے شرماتے ہوئے کہا۔
"تو میں بھی نہیں بجاؤں گی"۔ اور مسکرا کر سرجیت اس کے پاس کوچ پر بیٹھ گئی۔
"تو میں جاؤں" سریندر نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔
"اوں ہونہہ" سرجیت نے صورت انکار سے سر ہلایا۔ پھر اٹھ کر الماری سے ایک پلیٹ نکالی۔ اور اس میں کچھ انگور، آڑو اور ایک سیب رکھ کر سریندر کے پاس لے آئی۔
"لو کھاؤ"
"آپ ریکارڈ تو بجاتی نہیں"
"پہلے یہ کھا لو"
"پھر بجائیں گی"
"ہاں ہاں ضرور"
سریندر پلیٹ سے انگور اٹھا اٹھا کر کھانے لگا اور سرجیت آڑو چھیل چھیل کر اسے دینے لگی۔ آڑو چھل چکے تو سرجیت چھری لے کر سیب چھیلنے لگی سریندر نے سرجیت کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔
"شیب میں نہیں کھاؤں گا"
"کیا نہیں کھائے گا"
"شیب"
اور سرجیت پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سریندر کے چہرہ کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کہو سیب"

اور سمندر نے بھی سرجیت کو بے طرح کھلتا ہوا دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"شیب"

اور سرجیت نے جلدی سے سیب کی ایک کٹی ہوئی پھانک سمندر کے منہ میں ڈال دی۔ اور پھر جی کھول کر ہنسنے لگی۔ سمندر نے بھی اس کی ہنسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھرے منہ سے کہا۔

"اب وہ ریکارڈ بجاؤ نا"

اور سرجیت نے مزید کسی تکرار کے بغیر ہنستے ہوئے گراموفون پر وہ ریکارڈ لگا دیا۔ پھر اسی طرح ہنستی ہوئی سمندر کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور اٹھایا سیب چھیل کر دینے لگی۔

سمندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب بش"

"بس"

"ہاں بش"

اور سرجیت اور بھی کھل کر ہنس اٹھی۔ دفعتہً ایک پُراسرار مسکراہٹ اس کے چہرہ پر کھل اٹھی۔ اور اس نے سمندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"کہو سرجیت"

"شرجیت"

"کہو سنگ"

"شنگ"

"سونا"

"شونا"

"سرجیت سنگ سونا"

"سرجیت سنگ شونا"

اور پیشتر اس کے کہ سرندر اس سرجیت سنگ سونا کا مطلب سمجھتا اور مطلب سمجھ کر بھی شاید وہ کچھ نہ سمجھتا۔ سرجیت نے کھلکھلاتے ہوئے اُسے بازو سے کھینچ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس کے لب و رخسار پر بے انداز بوسے دے ڈالے۔ اُسے زور سے اپنے سینہ سے بھینچ لیا۔ اور ہنستے ہنستے نڈھال ہو کر کوچ پر لیٹ گئی۔

پھر جس تیزی سے یہ مستی اٹھی تھی اسی تیزی سے غائب بھی ہو گئی۔ اور اس نے سرندر کو الگ ہٹاتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر ریکارڈ تبدیل کر دیا۔ ساڑھی کو درست کیا اور پھر سے سرندر کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"اور کچھ کھاؤ گے"

"نا لش"

"لش" سرجیت نے پیار سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"جی۔ اب مجھے گھر جانا ہے"

"ابھی بیٹھو نا" سرجیت نے سرندر کے قریب سرکتے ہوئے کہا

"نا۔ مجھے ابھی شکول کا کام کرنا ہے"

"شکول کا" سرجیت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی"

"کل آؤ گے"

دفعتہً سرندر کو اپنے یہاں آنے کا مقصد یاد آ گیا۔ اس نے نگاہیں

مہرجبیں نے چہرہ پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے اپنے باغیچہ میں سے ٹماٹر لینے دیں گی؟"

"کیوں نہیں"

"تو میں کل آؤں گا"

"ٹماٹر لینے ؟"

"نہیں۔ ٹماٹر تو میں اب لیتا جاؤں گا۔"

"تمہیں ٹماٹر اچھے لگتے ہیں؟"

"جی"

"اور میں"

"آپ تو بہت ہی اچھی ہیں"

"سچ"

"سچ"

اور ایک بار پھر مہرجبیں نے بے اختیار ہو کر سمندر کا منہ چوم لیا۔ پھر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس نے سمندر سے کہا

اچھا جاؤ۔ جتنے جی چاہے ٹماٹر توڑ لو۔ لیکن یاد رکھنا۔ کل یہاں ضرور آنا۔

. . . .

سمندر جب میرے کمرے میں آیا۔ تو وہ بے طرح کھل رہا تھا۔ اور اس کے رخسار ٹماٹر کی طرح سرخ تھے۔ میں نے اس کی اس بے طرح ہنسی کا سبب پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"انگور کھائے ہیں۔ آڑو کھائے ہیں اور سیب بھی۔

اچھا؟

"ہاں ہاں" اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا

"پتاجی لائے ہیں"

"اوں ہونہہ" اس نے اسی انداز میں جواب دیا

"پھر"

"سرجیت ممی نے کھلائے ہیں" اس نے منہ میرے کان کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ معاً میری نظر اس کے کوٹ کے پاکٹوں پر پڑی جو بے طرح پھول رہے تھے۔

"ارے" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "یہ اتنے ٹماٹر کہاں سے توڑ لائے"

"اُن کے باغ سے"

"تو پھر ایک دن مار بھی کھاؤ گے"

"اوں ہونہہ" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مار نہیں کھاؤں گا۔ جیت جی کہتی ہیں۔ جتنے جی چاہے ٹماٹر توڑ لو۔۔۔۔"

پھر اس نے میرے قریب آکر آہستہ آہستہ دبی آواز میں سب واقعہ من وعن سنا دیا۔ میں ابھی اس کی باتوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ وہ کھلکھلاتا ہوا اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

اس کے چلے جانے کے کافی دیر بعد تک میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ نوجوان کنواری لڑکیاں اپنی جنسی بھوک کو مٹانے کے لئے چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو تختہ مشق کیوں بنانے لگتی ہیں۔ اور اب دیکھئے کب تک سرندر کے گال ہر روز ٹماٹر بنتے ہیں لیکن بہت سوچنے کے باوجود جب مجھے

ان باتوں کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ تو میں پھر سے کاپی پر مسطر و پرکار سے جیومیٹری کی شکلیں بنانے میں محو ہوگیا۔

دوسرا باب

ہمارے بنگلہ کے عین سامنے سڑک کے دوسری جانب ایک اور بنگلہ تھا۔ جس میں کوئی مسٹر کے۔ ایل۔ اہلووالیہ رہا کرتے تھے۔ وہ کیا کرتے تھے۔ یہ نہ تو ہمیں اس وقت معلوم تھا نہ اب۔ ہاں ہمیں یہ معلوم تھا کہ وہ کبھی کبھی اپنے بنگلہ کی گراؤنڈ میں بیڈمنگٹن کھیلا کرتے تھے اور اس کھیل میں ان کے ساتھ عموماً تین عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک تو مسز کے۔ ایل اہلووالیہ۔ دوسرے مسٹر اہلووالیہ کی بہن جو شاید ودھوا تھیں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی عمر کے لحاظ سے انہیں کنواری کہا نہیں جا سکتا تھا اور ان کا سہاگ وتی ہونا اس لئے مشکوک تھا کہ نہ تو وہ ماتھے پر بندی لگاتی تھیں اور نہ ہی مانگ میں سیندور چھڑکتی تھیں۔ پھر جتنا عرصہ ہم وہاں رہے ہم نے کبھی انہیں ایک دن کیلئے بھی کہیں جاتے نہ دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سسرال سے لڑ کر میکے آگئی ہوں۔ لیکن ان سی حلیم طبع عورت کا لڑنا بھی تو کچھ قرین قیاس نظر نہ آتا تھا۔

تیسرے نمبر پر تھیں نوری مسز و بجے کھوسلہ جو مسٹر اہلو والیہ کی اکلوتی لڑکی مس ارملا اہلو والیہ کی معلمہ تھیں اور وہیں ان کے پاس بنگلہ میں سکونت رکھتی تھیں۔

مس ارملا ایک بھولی بھالی خوش شکل و خوش گاو لڑکی تھی جو آزادانہ ایک تیتری کی طرح باغ کی ایک روش سے دوسری روش پر تھرکتی رہا کرتی تھی۔ اس وقت اس کی عمر کوئی دس گیارہ کے لگ بھگ تھی۔

اس بنگلہ کی سب سے بڑی جاذبیت ہمارے لئے اس کے انگور اور لوکاٹ تھے جن کے بڑے بڑے خوشے بنگلہ کی دیوار سے جھانکتے دکھائی دیتے تھے اور سر ندر کو روز اول سے نوید عمل دے رہے تھے۔ لیکن ان خوشوں تک دسترس میں سب سے بڑی رکاوٹ مسٹر اہلو والیہ کا مالی تھا۔ جو کمال چوکسی سے ان کی رکھوالی کرتا تھا اور کسی غیر کو باغ کے نزدیک پھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ سوچ سوچ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس بنگلہ میں آمد و رفت شروع کرنی چاہیئے۔ پھر موقعہ پا کر انگور اور لوکاٹوں پر ہاتھ صاف کرنے چاہئیں۔

سر ندر کو لڑکپن سے ہی ان تمام کھیلوں سے انس تھا جو محض لڑکیوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اور وہ ان میں ایسی مہارت رکھتا تھا کہ لڑکیوں کو بھی کیا نصیب ہوگی۔

ایک صبح سر ندر اپنے بنگلہ کے پھاٹک کے قریب کھڑا انگور کے خوشوں کی جانب للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ مس ارملا رسی ٹاپتی ہوئی اپنے بنگلہ کے پھاٹک کے قریب آئی۔ میں اسے رسی ٹاپنا ہی کہوں گا کیونکہ خالص نسوانی اصطلاح میں اسے رسی ٹاپنا ہی کہا گیا ہے۔ اسلئے مجھے ڈر ہے کہ

میں نے اس کی جگہ پھاندنا یا کودنا کا لفظ استعمال کیا۔ تو بہت کم لوگ میرے مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔ خیر تو یہ ایک نہایت ہی عام کھیل ہے اور شاید ہی کوئی ایسی پنجابی لڑکی ہوگی جس نے کسی نہ کسی عمر میں رسی نہ ٹاپی ہوگی۔ اس کھیل میں رسی ٹاپنے والی لڑکی تقریباً ۲ گز لمبی رسی (لمبائی قد کے مطابق کمتی بڑھتی ہو سکتی ہے) کے دونوں سرے ہاتھوں لیکر رسی کو صورت دائرہ تیزی سے جسم کے گرد گھماتی ہے۔ اور جب بھی یہ رسی اس کے پاؤں کے قریب پہنچتی ہے خود پھرتی سے پھاند جاتی ہے۔ بس اس مسلسل کودا پھاندی کا نام ہے رسی ٹاپنا۔

سرندر نے جب ارملا کو رسی ٹاپتے دیکھا تو اس کے دماغ نے جھٹ سے بنگلہ میں جانے کی تدبیر سوچ لی۔ وہ دوڑا ہوا اپنے کمرہ میں گیا۔ اور اپنی رنگدار ڈوری کی رسی جس کے دونوں سروں پر لکڑی کے دو دستے لگے ہوئے تھے اٹھا لایا اور بنگلہ کے پھاٹک کے قریب کھڑا ہو کر ٹاپنے لگا۔ سرندر کو رسی ٹاپنے کے بہت سے ایسے کرتب آتے تھے جو بہت کم لڑکیوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے پہلے تو سیدھی رسی ٹاپی۔ پھر الٹی۔ پھر الٹی رسی ٹاپتے ہوئے پھول ٹو ڈالنے شروع کئے۔ پھر سیدھی رسی میں قینچی چلائی اور انجام کار چرخہ کاتنے کی صورت میں ٹاپنے لگا۔ بس اتنا کافی تھا۔ ارملا کچھ عرصہ تو ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر بغیر کسی تمہید کے اس کے پاس چلی آئی۔ اور سرندر کو مخاطب کرکے کہنے لگی۔

"مجھے بھی پھول ٹو ڈالنا سکھا دو"

"تم نہیں سیکھ سکو گی"۔

"تم سکھاؤ تو سہی۔ دیکھ لینا میں سیکھ لوں گی۔

"یہاں نہیں - یہاں ماما جی رسی سے کھیلتا دیکھ لیں گی تو خفا ہونگی"

"تو پھر آؤ ہمارے بنگلہ میں"

"اچھا چلو"

اور شاداں و فرحاں سرندر ارملا کے ساتھ ہولیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" چلتے چلتے سرندر نے پوچھا

"ارملا اور تمہارا"

"سرندر"

"ہوں"

باغ میں پہنچتے ہی سرندر نے ایک فتحمندانہ نظر انگور کے خوشوں پر ڈالی گویا کہہ رہا ہے۔ کہ آج نہیں تو کل تم میرے منہ میں ہوگے۔ ارملا نے رُکتے ہوئے کہا۔

"یہاں سکھاؤ گے"

اور سرندر نے بے نیازی سے جواب دیا "یہیں سیکھ لو"

"تو سکھاؤ"

"اچھا دیکھو۔ پہلے میں رسی ٹاپتا ہوں۔ میری طرف اچھی طرح سے دیکھتے رہنا"

"اچھا"

"یہ دیکھو۔ پہلے اس طرح سے الٹی رسی گھمائی جاتی ہے۔ پھر یوں ہاتھوں کو قینچی کی صورت میں لیجا کر یوں پھول ڈالا جاتا ہے۔ سمجھی!"

"جی"

تو پھر ڈالو پھول۔ لیکن یاد رکھنا۔ رسی کے پاؤں کے نیچے سے نکلتے ہی

ہاتھوں کو ہنیچی کی صورت میں لے جانا۔ ورنہ پھر رسی اُلجھ جائے گی۔"

لیکن کوشش اور احتیاط کے باوجود رسی ارملا کی ٹانگوں میں اُلجھ گئی اور وہ گرتے گرتے بچی۔

"بس ڈال لیا پھول" سرندر نے طنز سے کہا۔ "میں نے نہ کہا تھا۔ کہ تم سے پھول نہیں ڈالا جائے گا۔"

"ڈال لونگی۔ ڈال لونگی" ارملا نے خوشامند ی سے کہا "یہ تو پہلی بار تھی نا۔ تم ایک دفعہ پھر پھول ڈال کر بتاؤ۔"

"اچھا دیکھو" سرندر نے دوبارہ پھرتی سے پھول ڈالنا شروع کیا۔

"ارملا ——" کسی نے قریب ہی سے آواز دی اور سرندر کے پھرتی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ جہاں کے تہاں رک گئے۔ اس نے مڑ کر اس جانب نگاہ کی تو ایک خاتون کو قریب ہی ایک روش پر کھڑا پایا۔ اسی اثنا میں ارملا لپک کر نو وارد کے قریب پہنچ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

"ممی دیکھو نا سرندر کیسی اچھی رسی ٹاپتا ہے۔"

سرندر بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسز اہلوالیہ کے قریب پہنچ گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "نمستے چاچی جی"

"جیتے رہو بیٹا" مسز اہلوالیہ نے پیار سے سرندر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم کیا یہیں کہیں رہتے ہو؟"

"جی سامنے والے بنگلہ میں" سرندر نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو تحصیلدار صاحب کے خالی حصہ میں تم آئے ہو۔"

"جی۔ بس وہیں۔"

"تمہیں رسی ٹاپنا تو خوب آتا ہے۔"

"جی۔ بس ذرا آتا ہی ہے۔"

"ہمیں بھی ٹاپ کر دکھاؤ۔"

"جی۔ کچھ اتنا اچھا تو نہیں آتا۔ آپ کو شاید پسند نہ آئے۔"

"ممی۔" ارملا نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "سرندر بہت اچھی رسی ٹاپتا ہے۔"

"ذرا ہمیں بھی دکھاؤ نا۔"

"آپ کی یہی خواہش ہے تو دیکھ لیجئے۔" اور سریندر نے چند قدم پیچھے ہٹ کر رسی ٹاپنا شروع کر دی۔ پہلے آہستہ آہستہ۔ پھر تیز۔ پھر بہت تیز۔ پھر ایک پاؤں پر۔ پھر دونوں پاؤں پر۔ پھر سائیکل۔ پھر قینچی۔ پھر چرخہ۔ پھر پھول۔ اور ایک باکمال مداری کی طرح چند ہی منٹوں میں اس نے اپنے سب کرتب دکھا دیئے۔ اور پھر ہانپتا ہوا مسز اہلوالیہ کے قریب آ گیا۔

"بہت خوب" مسز اہلوالیہ نے شفقت سے سرندر کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "تم تو بہت ہوشیار نظر آتے ہو۔"

"آپ کی مہربانی ہے۔" سرندر نے نیچی نظریں کئے ہوئے جواب دیا۔

مسز اہلوالیہ سرندر کی گفتگو سے بے حد متاثر ہوئیں اور انھوں نے اس کی پیشانی پر پیار سے بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آؤ بیٹا پہلے چائے پی لو۔ پھر رسی ٹاپنا"

"جی اب میں گھر جاؤں گا" سرندر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیوں"

"چائے کے وقت میں گھر پر نہ ہوا تو ماتا جی سمجھیں گی۔ کہ آوارہ گھوم رہا ہوں۔"

"تمہیں ماتا جی سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"جی ضرور تو لگنا ہی چاہیے۔ ویسے انھوں نے آج تک کبھی مجھے گھر کی بھی نہیں دی۔"

"ایسے اچھے بیٹے کو کون گھرکی دیگا۔" مسز اہلوالیہ نے سرندر کی ٹھوڑی اٹھا کر پیار بھری نظریں اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

لیکن سرندر کو پھر بھی ہچکچاتا دیکھ کر مسز اہلوالیہ نے آواز دی۔

"مالی —— او مالی!"

"جی —— بی بی جی"

"سامنے بنگلہ میں کہہ آؤ۔ سرندر آج یہاں چاء پئے گا۔"

"بہت اچھا بی بی جی"

اور مالی سلام کر کے چلا گیا۔

مسز اہلوالیہ نے سرندر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اب آؤ چلیں۔"

اور سرندر آہستہ آہستہ سر نیوڑائے ساتھ ہو لیا

مسز اہلوالیہ کو سرندر کی باتوں سے کچھ ایسا انس ہوا۔ کہ بجائے اس کے کہ وہ آج بھی حسب معمول گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ چاء پیتی۔ اس نے اپنے، ارملا اور سرندر کے لئے اپنے کمرہ میں علیحدہ چاء طلب کی۔

پیالوں میں چاء ڈالتے ہوئے مسز اہلوالیہ نے سرندر سے پوچھا

"چینی کتنی ڈالوں۔"

"جی دو چمچہ"

"بس دو چمچہ۔ ہماری ارملا تو ہمیشہ چار چمچے ڈالتی ہے۔"

"جی۔ ماتا جی کہتی ہیں زیادہ چینی پینی اچھی نہیں ہوتی۔"

"اچھا آج تین چمچے پی لو۔ ماتاجی کچھ نہیں کہیں گی۔" اور مسکراتے ہوئے مسز اہلوالیہ نے سریندر کی پیالی میں تین چمچے چینی ملادی۔

چائے پی چکنے کے بعد مسز اہلوالیہ نے سریندر سے پوچھا۔

"پھل کھاؤ گے؟"

"جی اب نہیں"

"تمہیں پھل اچھے نہیں لگتے۔"

"جی پھل تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ پر ماتاجی کہتی ہیں۔ چائے پینے کے بعد پھل کھانا صحت کے لئے کچھ اچھا نہیں ہوتا۔"

"سب باتیں تمہاری ماتاجی کہتی ہیں۔" مسز اہلوالیہ نے ہنستے ہوئے کہا "اور تم کچھ بھی نہیں کہتے۔"

"جی۔ میں بھی کہتا ہوں"

"کیا"

"جو کچھ ماتاجی کہتی ہیں۔"

اور مسز اہلوالیہ اس گیارہ سال بچے کی سادگی و عقیدت سے اس درجہ متاثر ہوئیں کہ انھیں چار میں دو چمچے کی بجائے تین چمچے چینی ڈلوانے پر پریشانی سی محسوس ہونے لگی۔ انھوں نے سریندر کی عقیدت کو اور مجروح نہ کرنا چاہا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا کھاؤ مت۔ ساتھ لیتے جاؤ۔" اور سریندر کے انکار کرتے کرتے مسز اہلوالیہ نے اس کے رومال میں انگوروں کے دو بڑے بڑے خوشے باندھ دیئے۔

سریندر جب واپس اپنے بنگلہ کو لوٹنے لگا تو مسز اہلوالیہ نے پیار سے کہا۔

"یہاں آتے رہا کرو بیٹا۔ یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے"

سرندر کے لئے یہ دعوت بے معنی تھی۔ کیونکہ اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اب وہ اکثر و بیشتر یہاں آیا کرے گا۔ تاہم اس نے انکسارانہ انداز میں کہا۔

"جی بس آیا ہی کروں گا"

ارملا باغ کے پھاٹک تک سرندر کے ساتھ آئی۔ جہاں دونوں نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اور ان شوخ مسکراتی ہوئی آنکھوں نے زبان کی ترجمانی کے بغیر ہی فیصلہ کرلیا۔ کہ وہ آج سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

۲

چند ہی دنوں میں سرندر اور ارملا کی گاڑھی چھننے لگی۔ ارملا بیباکانہ سرندر کے کمرہ میں در آتی اور اس کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتی۔ یہاں تک کہ اس کی پرائیویٹ الماری کو جسے مجھے بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی وہ اس انداز سے کھولتی۔ گویا وہ کسی ناکارہ کتاب کے ورق الٹ رہی ہے۔ پھر جو چیز اسے پسند آتی۔ سرندر سے پوچھے بغیر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی اور سرندر اُف تک نہ کرتا۔ اس کا شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سرندر بھی اپنی یاری پر کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ اور ارملا کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ ان ایام میں مسز اہلوالیہ کی عنایات بھی سرندر پر بیش سے بیشتر ہوتی چلی گئیں۔ اسلئے وہ مقصد جسے لیکر سرندر نے اس بنگلہ میں آمدورفت شروع کی تھی قریب قریب فوت ہوگیا۔ انہی ایام میں ایک دن

مسز اہلوالیہ نے ایک ٹوکرہ پھلوں کا سرندر کے گھر بھی بھجوا دیا۔ جس کے جواب میں ایک میٹھی نمکین پستہ کی پہنچ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ لین دین کا سلسلہ شروع ہوا اور راہ ورسم بڑھتے بڑھتے بڑھ گئے۔ سرندر کا یہ حال تھا۔ کہ ادھر سکول سے آیا۔ جزدان اپنے کمرہ میں رکھا۔ عابدی سے کچھ ناشتہ کیا اور جھٹ سے مسز اہلوالیہ کے بنگلہ میں۔

کبھی کبھی ارملا اس پر سبقت لے جاتی اور ابھی سرندر ناشتہ کر ہی رہا ہوتا کہ وہ اس کے سر پر آ دھمکتی۔ پھر رسی ٹاپنا۔ گیند کھیلنا۔ توتکڑہ ٹوالنہ۔ پلنج گیٹی کھیلنا۔ غرضیکہ سب نسوانی کھیل کھیلے جاتے تھے۔

لیکن عورتیں تو مسٹر اہلوالیہ کے بنگلے میں بیڈ منٹن کھیلا کرتی تھیں۔ جسے کم از کم ہندستان میں تو صرف ½ نسوانی کھیل کہا جا سکتا ہے۔ سرندر کو بھی عورتوں کا یہ لچک لچک کر ریکٹ سے چڑی اچھالنا بیحد مرغوب ہوا۔ اور وہ کئی کئی منٹ نٹ کے قریب کھڑا ہو کر ان کی اس تگ ودو سے لطف اندوز ہونے لگا۔

ایک دن مسٹر اہلوالیہ کہیں گئے ہوئے تھے اور ان کھلاڑی عورتوں کو چوتھا ساتھی میسر نہ آ رہا تھا۔ مسز اہلوالیہ نے سرندر کو جو قریب ہی تھے دیکھا تو اسے کھیلنے کے لئے دعوت دی۔ سرندر کو ایسے موقعے خدا دے۔ اس نے دعوت کو لبیک کہا۔ اور جھٹ سے ریکٹ لیکر گراونڈ میں پہنچ گیا۔ ایک دو بار تو اس نے عجیب عجیب حرکتیں کیں۔ لیکن بہت جلد سنبھل گیا اور چند دن میں تو شاٹ پر شاٹ لگانے لگا۔

سرجیت نے جب دیکھا کہ سرندر کے وقت کا زیادہ حصہ کھیل کود اور ارملا پر ضائع ہو رہا ہے۔ تو اس نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول

کرنے کے لئے نت نئے ریکارڈ خریدنے شروع کر دئے - اب پھر سرندر سرجیت کی جانب کھنچنے لگا - پھر ایک عجیب ہی واقعہ پیش آیا -

اس دن شاید اتوار تھا - سرندر نہانے کے بعد دھوتی باندھے برآمدہ میں ایک جانب کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا کہ دوسری جانب سے سرجیت آئی - سرندر کا دھوتی باندھنے کا انداز بالکل نسوانی تھا - وہ ہمیشہ دھوتی کا ایک پلو ساڑھی کی طرح کندھوں پر ڈال لیتا تھا - اور کبھی کبھی تو آنچل سر پر بھی اوڑھ لیتا تھا - آج بھی وہ اس ہیئت میں سورج کی جانب منہ کئے بیٹھا تھا - اور اس کے بیٹھنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا سرجیت نے پشت پر سے دیکھتے ہوئے یہ خیال کیا - کہ آج ان کے گھر کوئی لڑکی مہمان آئی ہے - سرندر کی ماں برآمدہ میں ایک جانب بیٹھی سلائیوں سے سویٹر بُن رہی تھی - سرجیت نے سرندر کی ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا -

"ماں جی - یہ لڑکی کون آئی ہے ؟"

کون - سرندر کی ماں نے نگاہیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا - اور پھر سرندر کو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہنے لگی -

"اب جا کر خود ہی دیکھ لو نا"

اور سرجیت بغیر کسی جھجک کے کرسی کی جانب چلدی - سرندر جو مزے سے بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا اس وقت تک چپکے سے بیٹھا رہا جب تک کہ سرجیت اس کے بالکل قریب نہ پہنچ گئی - پھر دفعتہً وہ پلٹا اور زور سے چلایا

"ہوؤ ووو"

ایک لمحہ کے لئے سرجیت کچھ بوکھلاسی گئی۔ لیکن سرندر کو دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی ہنسی امڈ کر آئی۔ اس نے کھلکھلاتے ہوئے سرندر کو بازو سے پکڑا اور اس کی ماں کے قریب لے آئی۔ جو سویٹر کو ایک جانب رکھے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئی جارہی تھی۔ سرجیت نے ہنستے ہنستے سرندر کی ماں سے کہا۔

"ماتا جی میں ذرا اس لڑکی کی کنگھی پٹی کر دوں۔ بچاری کے بال بے طرح کھل رہے ہیں۔"

اور پھر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر سرندر کو ساتھ لے کر اپنے کمرہ کی جانب چل دی۔ سرندر بھی کھلکھلاتا ہوا ساتھ ہولیا۔ اپنے کمرہ میں پہنچ کر سرجیت نے سرندر کو کوچ پر آرام سے بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر ایک چالاک مشاطہ کی طرح سرندر کے لمبے لمبے بالوں کو گیسوؤں کی صورت میں آراستہ کرنے لگی گزشتہ چند دنوں سے سرجیت نے سرندر کو انگور اور آڑو کھلا کھلا کر اس قدر رام کر لیا تھا۔ کہ اب اس میں سرجیت کی بات ٹالنے کی جرأت نہ تھی۔ پھر اسے خود بھی اس مذاق میں لطف آرہا تھا۔ اس نے چپکے سے اپنا سر سرجیت کے سینے سے لگا دیا۔ اور آنکھیں بند کر کے خود کو سرجیت کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ سرجیت نے پہلے تو اس کے بالوں کو آراستہ کیا۔ پھر آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ ماتھے پر بندی لگائی۔ ہونٹوں کو سرخی دی۔ رخساروں پر پوڈر لگایا اور انجام کار اس کی مانگ میں سیندور بھی چھوڑ دیا۔ سرندر پر ویسے ہی زنانہ حسن غالب تھا۔ اس آرائش نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ لیکن سرجیت نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور الماری سے ہلکے سرمئی رنگ کے ساڑھی و بلوز اٹھا لائی اور سرندر کو بلوز دے کر کہنے لگی۔

"لو اسے پہنو۔"

"اوں ہونہہ۔ میں نہیں پہنوں گا۔"

"کیوں"

"ماتا جی مار دینگی"

"ارے پاگل نہیں ماریں گی۔ الٹا مٹھائی کھانے کو دینگی۔"

"اور اگر مارا تو"

"میں ذمہ دار"

"اور اگر مٹھائی نہ دی۔"

"تو بھی میں ذمہ دار"

"اوں ہونہہ پیچھے تم مکر جاؤ تو"

"اچھا یہ بات ہے۔" سرجیت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پلیٹ میں کچھ مٹھائی اور نمکین لسّہ رکھ کر لے آئی۔

"لو پہلے کھا لو۔ پیچھے پہننا۔"

"یہ بات نہیں" سرندر قلاقند کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے لڑکیوں کے سے کپڑے پہنتے شرم آتی ہے۔"

"اور یہ جو صبح سے لڑکیوں کی دھوتی باندھ رکھی ہے۔"

"اس کا کیا ہے۔"

"تو پھر اس کا کیا ہے۔" سرجیت نے پیار سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"نہ مجھے شرم آتی ہے۔"

"جھوٹا کہیں کا۔"

"تم لڑکوں کے اتنے کپڑے پہنو تو تمہیں شرم نہ آئیگی"

"اوں ہوں نہہ"

"تو پھر پہلے تم چاچا جی کی پتلون پہن کر دکھاؤ"

سرجیت ایک لمحہ کے لئے ہچکچائی۔ اچانک ایک اسے ایک اور ہی شرارت سوجھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

"اور اگر میں پہن لوں تو"

"تو پھر میں بھی پہن لوں گا"

"ہوا پکا وعدہ"

"جی"

سرجیت لپک کر سردار صاحب کے کمرے سے ان کا ایک مکمل سوٹ اٹھا لائی۔ پھر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر لباس تبدیل کرنا شروع کیا۔ پہلے قمیص بدلی۔ پھر پتلون چڑھائی۔ جو بکلس کھینچنے پر بھی ڈھیلی نظر آئی سرجیت نے جھٹ سے ایک رومال سے کر اسے تہ کیا اور بیلٹ کی جگہ باندھ لیا۔ پھر ٹائی باندھی۔ کوٹ پہنا گیسوؤں کو کیسوں کی صورت میں تبدیل کیا اور دستار باندھ کر لڑکا بن گئی۔ سرندر اسے دیکھتا جاتا تھا اور کھلکھلاتا جاتا تھا۔ سرجیت کے لباس پہنتے پہنتے سرندر کا مارے ہنسی کے برا حال ہوگیا۔ پھر جب سرجیت لباس پہن کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تو وہ کھلکھلاتا ہوا دروازہ کی جانب بڑھا۔

"کہاں چلے" سرجیت نے ٹوکتے ہوئے کہا

"ماتا جی کو کہتا ہوں سرجیت لڑکا بنی ہے۔ ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی"

"پہلے ساڑھی اور بلاوز تو پہنو"

"اوں ہونہہ۔ پہلے ماتا جی کو منا لوں۔" اور کہتے کہتے سرندر پہر زور سے ادہر کی جانب لپکا۔

"دیکھو سرندر تم ماتا جی کے پاس گئے تو پھر میں تم سے کبھی نہ بولوں گی۔"

"نہیں تو میں جھٹ سے منا لوں گا۔" سرندر نے شوخی سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں ہرگز نہیں مانوں گی۔" سرجیت نے خفگی سے منہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ "اور ہمارے پاس ایک ایسی چیز ہے کہ تم دیکھو تو پھڑک اٹھو۔"

"کیا" سرندر نے مجسم اشتیاق بنتے ہوئے کہا

"تمہیں نہیں دکھاؤں گی۔ تم کوئی میری بات مانتے ہو۔"

"مانوں گا پہلے دکھاؤ تو سہی"

سرجیت اٹھی اور الماری سے ایک خوبصورت ڈبہ اٹھا لائی۔ سرندر دیکھتے ہی چلایا۔ "اوہو چاکلیٹ"

"ہوں۔ سرجیت نے ڈبہ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور دیکھو کتنے بڑے ہیں" اور کہتے کہتے سرجیت نے ایک چاکلیٹ کا ورق اتار کر سرندر کی جانب بڑھا دیا۔ "لو کھا کر دیکھو" سرندر نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چاکلیٹ منہ میں رکھ لیا۔ "کیوں کیسے ہیں" سرجیت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چاکلیٹ تو بہت اچھے ہیں۔

"تم ساڑھی دوبارہ پہن لو تو یہ سارا ڈبہ تمہارا"

"سارا"

"ہاں سارا"

اور سرندر نے مزید فکر کرنا بے سود خیال کیا۔ چند ہی منٹ میں سرجیت نے سرندر کو ساڑھی و بلوز پہنا کر دلہن بنا دیا۔ اور ساڑھی کے پلو سے تھوڑا سا گھونگٹ بھی نکال دیا۔ پھر جگہ جگہ سیفٹی پن لگا دیئے تا کہ چلنے میں ساڑھی کا آنچل کھسک نہ جائے۔ اتنا کر چکنے کے بعد اس نے ایک ناقدانہ نظر سرندر پر ڈالی۔ اُسے سرندر اس لباس میں اتنا بھلا معلوم ہوا کہ اس نے بیقرار ہو کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ پھر پیار سے کہنے لگی۔

"دیکھو سرندر۔ تم میرے گھر والی۔ اور میں تمہارے گھر والا۔"

"اوں ہونہہ۔ تم تو لڑکی ہو۔"

"اس کا کیا ہے۔ اس وقت تو لڑکا ہوں۔ اب آؤ چلیں ماتا جی کے پاس"

"تم بھی ایسے ہی چلو گی۔"

"ہوں"

اور سرندر پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "چلو"

"دیکھو سرندر ہنسو نہیں۔ اس طرح سب کھیل بگڑ جائے گا۔ بس چپکے سے سر نیوڑائے ساتھ ہو لو۔ ہاں بس اس طرح" پھر اُسکے کان میں کچھ کہا۔ جسے سمجھ کر سرندر نے کہا "ہوں یہ بات ہے" اتنے میں سرجیت لپک کر اپنے والد کی چھڑی اٹھا لائی اور اسے بغل میں دا ب سرندر کو ساتھ لے کر اکڑ اکڑ کر چلتی ہوئی سرندر کی والدہ کے پاس پہنچ گئی۔ سرندر کی والدہ سویٹر بننے میں محو تھی۔ سرجیت نے کھنکار تے ہوئے کہا۔

"دیکھو ماتا جی آپ کے لئے کیسی اچھی بہو لایا ہوں" کہتے کہتے سرجیت ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر چھڑی سے بوٹ کی نوک پر ضربیں لگانے لگی۔

"اری سرجیت تم"۔ سرندر کی ماں نے چونک کر کہا "اور یہ میرے لال کو کیا کیا ہے ؟"

"اری سرجیت نہیں"۔ مسٹر سرجیت کہیے"۔ سرجیت نے ایک بار پھر کھنکھارتے ہوئے کہا۔ "اور یہ آپ کا لال نہیں۔ آپ کی بہو ہے۔ پاؤں چھوری اپنی ساس کے"۔

سرندر سرجیت کے سکھلانے کے مطابق آگے بڑھا لیکن پیشتر اس کے کہ وہ والدہ کے پاؤں چھوئے۔ والدہ نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اور ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"میرے بیٹے کو تو نظر لگا دے گی سرجیت"

اور سرجیت کے کچھ جواب دینے سے پہلے سرندر کی ماں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر سرندر اور سرجیت کا سروارنا[ث] کیا۔ پھر دونوں کی پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیا

سرجیت نے مسکراتے ہوئے سرندر کی ماں سے کہا۔ "ماتا جی بہو کو منہ دکھائی تو دی ہی نہیں"۔

"اچھا یہ بات ہے"۔ سرندر کی ماں نے ان کے مذاق میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔ پھر ایک پانچ روپے کا نوٹ سرندر کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے گھونگھٹ اٹھا کر کہنے لگی۔

"دیکھڑا تو چاند سا ہے"۔

ث ایک رسم جس میں کسی عزیز کو نظر بد سے بچانے کے لئے اس کے سر سے کچھ رقم گھما کر غربا کو صدقہ دی جاتی ہے۔

"بس اور کچھ کھانے کو نہ دو گی بہو کو" سرجیت نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی لو" اور سرندر کی ماں ایک پلیٹ میں کچھ میوہ۔ پستہ۔ باداموں کے مغز۔ کھاجا اور کچھ مٹھائی رکھ کر لے آئی۔

"خود کیسے کھائے گی"۔ سرجیت نے اضافہ کیا۔ "نئی نویلی دلہن ہے اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔"

اور سرندر کی ماں نے ہنستے ہنستے سرندر کو مٹھائی کھلانا شروع کی اتنے میں ایک جانب سے ارملا رسی ٹاپتی ہوئی آگئی اور سرندر اور سرجیت کو اس لباس میں دیکھ کر رسی ٹاپنا تو بھول گئی۔ خوشی سے ٹاپنے لگی۔ اور زور زور سے تالی بجانے اور ہنسنے لگی۔

"او ہو۔ ہو۔ سرندر لڑکی بنا ہے۔ آ ہا ہا ہا۔ سرجیت لڑکا بنا ہے ہی ہی ہی۔ ہو۔ ہو ہو۔ ہا۔ ہا ہا" اور وہ زور زور سے تالی بجانے اور کودنے لگی۔ کبھی سرندر کے پاس آتی اور نیچے جھک کر اس کے منہ کو دیکھتی۔ پھر قہقہہ لگاتی ہوئی سرجیت کے پاس چلی جاتی اور اس کے پتلون کو ہاتھ لگا کر پیچھے بھاگ آتی اور زور سے ہنستی۔ اس کے ان مسلسل قہقہوں نے وہ سماں باندھا کہ سرجیت کی ماں محض یہ دیکھنے کے لئے چلی آئی کہ ہمسایہ میں کہیں کسی ہنسنے والی گیس تو نہیں چھوڑ دی۔ برآمدہ میں قدم رکھنا تھا کہ وہ بھی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ سرجیت اپنی ماں کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے جھجکی لیکن پھر پہلے سا انداز اختیار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"دیکھو ماں جی۔ آپ کے لئے کیسی دلہن لایا ہوں"!

"ہوں" سرجیت کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر سمندر کی ماں کے قریب آکر کہنے لگی ۔ بہن تم اٹھو اب میں بہو کو کھلاتی ہوں۔"
"منہ دکھائی دینی پڑے گی"۔ سرجیت نے مسکراتے ہوئے کہا ۔
"منہ دکھائی پہلے"۔ سرجیت کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر سمندر کے ہاتھ پر دو روپے رکھتے ہوئے اس نے گھونگٹ اٹھا کر دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگی ۔
"بہو تو چاند سی ہے"۔ پھر خود سمندر کو مٹھائی کھلانے لگی ۔ ارملا دیکھتی جاتی تھی اور ہنس ہنس کر کود کود تالیاں بجاتی جاتی تھی ۔ ایکا ایکی اسے کچھ خیال آیا اور وہ رستی کھاتی ہوئی یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہوگئی ۔
چند ہی لمحہ بعد مسز اہلوالیہ بھی وارد ہوئیں اور ان کے پیچھے پیچھے ان کا نوکر دو پلیٹیں اٹھائے ہوئے جن میں ایک تو مٹھائی سے پر تھی ۔ اور دوسری میں انگور، آڑو، لوکاٹ تھے ۔ ساتھ ساتھ ارملا بھی چلی آتی تھی، ناچتی کودتی، تالیاں بجاتی ۔
مسز اہلوالیہ نے سمندر کے قریب آتے ہوئے کہا" ہم بھی بہو کا منہ دیکھیں گے"۔ اور بیشتر اس کے کہ سرجیت کچھ کہے مسز اہلوالیہ نے سمندر کی ہتھیلی پر ایک روپیہ رکھ دیا اور گھونگٹ اٹھا کر کہنے لگی ۔
"چاند سی بہو ہے"۔
مسز اہلوالیہ نے سرجیت کی ماں کی جگہ لے لی اور اپنے ساتھ لائی ہوئی پلیٹوں میں سے سمندر کو مٹھائی اور پھل کھلانے لگی ۔
نہ معلوم ساتھ کے بنگلوں میں کس نے خبر کر دی کہ آس پاس سے عورتیں سرجیت و سمندر کو دیکھنے جوق در جوق آنے لگیں پھر تو وہ دھما چوکڑی مچی وہ غل غپاڑہ ہوا ۔ کہ ہنسی کے دریا بہہ گئے ۔ سمندر کے قریب مٹھائی

اور پھلوں کے ڈھیر لگ گئے اور ۱۲ بارہ بجتے بجتے اس نے گیارہ روپے بٹور لئے پھر یہ بات جس طرح پھوٹ نکلی تھی اسی طرح غائب بھی ہو گئی ۔ یا شاید کھا نے کی طلب نے عورتوں کو مزید اس مذاق میں حصہ لینے نہ دیا ۔ جب سب عورتیں رفتہ رفتہ چلی گئیں تو سرجیت بھی اٹھنے لگی ۔ لیکن سرندر کی ماں نے دونوں کو یکجا بٹھا کر پھر ان کا سر وار نا کیا ۔ انہیں ہر مل کی دھونی دی پھر باری باری گلے سے لگا کر ان کی پیشانی پر شفقت سے بوسے دیئے ۔

سرندر بھی سرجیت کے ساتھ ساتھ اسکے کمرہ میں گیا جہاں ساڑھی و بلوز اتارنے سے پہلے سرجیت نے اسے جی بھر کر پیار کیا ۔ پھر منہ ہاتھ دھلایا ۔ اور چلتے چلتے چاکلیٹ کا ڈبہ اس کی بغل میں دیدیا ۔

. . . .

اس شام جب سرندر مسٹر اہلو الیہ کے بنگلہ میں گیا تو ارملا اس کا ہاتھ تھامے ہوئے اسے باغ کے اس گنجان گوشہ میں لے گئی ۔ جہاں درختوں کی افراط کی وجہ سے دن کو بھی تاریکی چھائی رہتی تھی ۔ پھر سرندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی ۔

"آؤ سرندر ہم بھی گھر گھر کھیلیں"

"نہ جی اب مجھ سے پھر نئے کپڑے نہیں پہنے جاتے"

"نہیں تم گھر والے بننا ۔ میں گھر والی بنوں گی"

"اس میں کیا مزا ہو گا"

"مزا ہو گا ۔ تم سنو تو سہی"

"اچھا بتاؤ"

"یہ ہوا ہمارا گھر" اور سرندر نے دیکھا کہ ارملا نے ایک جانب جنڈ

اینٹوں سے ایک ننھا سا کمرہ بنا رکھا تھا۔

"اور یہ باغ" ارملا نے اضافہ کیا۔

"ہوں"

"اب فرض کرو رات ہو گئی ہے۔ میں انگوروں کو کاٹ توڑ کر لاتی ہوں ہم پہلے رات کا کھانا کھائیں گے۔

"اچھا" اب سرندر نے بھی اشتیاق ظاہر کیا۔

"پھر ہم سو جائیں گے

"کیا یہیں"

"ہاں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر۔"

"پھر" سرندر نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"پھر پہلے جو اٹھے وہ دوسرے کا منہ چومے"

"پہلی دفعہ میں اٹھوں گا" سرندر نے شرط پیش کی۔

"اچھا تم ہی پہلے اٹھنا"

پھر کھیل کھیلنا شروع ہوا۔ ارملا انگوروں کو کاٹ توڑ لائی۔ جنہیں کھانے کے بعد ارملا نے ایک ہلکی انگڑائی لی۔ گویا نیند آ رہی ہے۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر وہیں گھاس پر لیٹ گئے۔ چند ہی لمحہ بعد سرندر اٹھا۔ اس نے ارملا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور سر جیت کے آزمائے ہوئے سب گر ارملا پر استعمال کر ڈالے۔

آپ اس کھیل کو ممکن ہے بیہودہ خیال کریں۔ لیکن چونکہ مجھے اصل واقعات بیان کرنے ہیں۔ میں اپنی طرف سے رنگ آمیزی کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن جہاں تک اس کی جاذبیت کا تعلق ہے میں اتنا ضرور

کہوں گا کہ یہ کھیل متواتر کئی سال کھیلا جاتا رہا حتیٰ کہ ایک بار پھر سرنڈر کے والد کی تبدیلی ہوئی۔ اور ہمیں پشاور سے راولپنڈی کا ٹکٹ لینا پڑا۔ لیکن ٹھہریئے۔ ابھی مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا ہے۔ ایک دن سرنڈر میرے کمرے میں بیٹھا مسز اہلوالیہ کے متعلق بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے ارملا سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔ کہتی ہیں یہ جیسے ارملا کا گھر ہے ویسے ہی تمہارا بھی گھر ہے۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "مزا تو تب ہے کہ تم بھی ارملا کی طرح انگور کے خوشے بلا پوچھے توڑ کر دکھاؤ۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میں جب چاہوں جتنے چاہوں مجھے خود ہی مل جاتے ہیں۔"

"توڑ بھی سکو" میں نے طنز سے کہا۔

"توڑ کیوں نہیں سکتا۔ مجھے کون روکنے والا ہے۔"

"تو پھر دکھاؤ توڑ کر"

"چلو میرے ساتھ" سرنڈر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں باہر ٹھیروں گا۔"

"اچھا تم باہر ہی ٹھیرنا۔ میں خوشے توڑ توڑ کر تمہاری طرف پھینکتا جاؤں گا۔"

مسٹر اہلوالیہ کے بنگلہ میں انگوروں کی بیل احاطہ دیوار کے قریب پیپل کے ایک درخت پر چڑھا دی گئی تھی۔ اور یہ درخت اس طرح شرقاً غرباً پھیلا ہوا تھا۔ کہ اگر آدمی کسی طرح بنگلہ میں گھس کر اس درخت پر چڑھ جائے تو بڑی آسانی سے انگوروں کے خوشے توڑ توڑ کر باہر پھینک

سکتا تھا۔ سرندر نے بھی اسی درخت کا سہارا لیا۔ اور مالی کی نظر بچا کر چپکے سے درخت پر چڑھ گیا۔ پھر لگے ہاتھ اس نے دو بڑے بڑے خوشے توڑ کر میری جانب بڑھا دیے۔ اور ہاتھ بڑھا کر ایک تیسرے خوشے کو زور سے کھینچا۔ شررڑ کی سی آواز ہوئی۔ پھر وہ خوشہ تڑاخ سے ٹوٹا اور پیش تر اس کے کہ وہ یہ خوشہ میری جانب پھینکتا۔ مالی کے چلانے کی آواز آئی

"کون ہوت ؟"

میں تو یہ آواز سنتے ہی نو دو گیارہ ہوگیا۔ اور وہ خوشہ سرندر کے ہاتھ میں ہی لٹکا رہ گیا۔

"میں ہوں" سرندر نے درخت سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

لیکن مالی پر سرندر کی "میں ہوں" کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اسکے بازو پکڑ کر مسز اہلووالیہ کے پاس لے گیا۔

"کیا ہے لے ۔۔۔۔ مسز اہلووالیہ نے مالی سے سرندر کو یوں پکڑ کر لاتے دیکھ کر پوچھا۔

"بی بی جی اس چھوکرے نے تو سگری بیل کا ستیاناس مار دیا"

"چھوڑو سرندر کو" ۔ ارملا ایک جانب سے چلائی۔

سرندر کی یہ حالت تھی کہ چہرہ کانوں تک سرخ ہو رہا تھا۔ اور انگور کا خوشہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کے ہاتھ سے گرا۔ کہ اب گرا۔

"چھوڑ دو اسے" مسز اہلووالیہ نے مالی کو اشارہ کیا "ادھر آؤ سرندر" اور سرندر سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسز اہلووالیہ کے قریب پہنچ گیا۔

"تمہیں چوری کی کیا ضرورت پیش آئی" مسز اہلووالیہ نے اسے

کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا
لیکن سمندر شاید اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہ کی اور کھڑے کھڑے مری آواز میں کہا۔
"یہ چوری کیسے ہوئی"
"کسی کی چیز کو بغیر اس کی اجازت کے لینا چوری ہے"
"لیکن آپ ہی نے تو کہا تھا کہ یہ بھی میرا گھر ہے۔ اپنے گھر سے کوئی چیز لینا تو چوری نہیں کہلاتا"
"یہ تو ٹھیک ہے" مسز امداد الیہ نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا "پھر بھی تمہیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔
"جی آپ سے پوچھتا اور بھیا سے ہار جاتا"
"ارے تو کیا بھیا سے شرط لگا کر آئے تھے"
"جی کچھ ایسی ہی بات تھی۔
"کیا بات تھی۔
"جی بس میں نے کہا تھا۔ کہ آپ مجھے ارملا کی طرح پیار کرتی ہیں"
"تو اس میں کیا شک ہے"
"جی یہ تو میں جانتا ہوں نا۔ لیکن وہ کہتا تھا۔ کہ ہم تب مانیں گے اگر اس بیل سے انگور توڑ کر لاؤ اور تمہیں کوئی کچھ نہ کہے"۔
"اچھا یہ بات تھی۔ میں بھی حیران تھی کہ میرے اچھے بیٹے سمندر نے یہ کیا نئی عادت سیکھی"
"جی بس ہو ہی گئی مجھ سے یہ غلطی۔ اور شرط بھی میں ہار گیا۔
"نہیں نہیں۔ یہ کیوں۔ مالی۔ او۔ مالی"

"جی بی بی جی"

"سرندر کو دو بڑے خوشے اور توڑ کر لا دو۔"

"بہت اچھا بی بی جی" اور مالی سلام کر کے چلا گیا۔

"نہیں جی۔ میں اور نہیں لوں گا۔"

"کیوں نہیں لو گے۔ یہ تمہیں لینے ہی پڑیں گے۔ ورنہ بھیا کو کیا دکھاؤ گے۔"

"یہ جو ہے۔ یہ دکھا دوں گا۔"

"اوں ہونہہ۔ ہم تو یہ دیں گے ہی۔" اتنے میں مالی انگور کے خوشے لے آیا اور مسز اہلوالیہ نے سرندر کے نہ نہ کرتے ہوئے بھی اُسے وہ خوشے پکڑا ہی دئیے۔

سرندر چلا تو ارملا بھی ساتھ ہولی۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہوئے ارملا نے شوخی سے کہا۔

"چوٹا!"

"تو چوٹی!" سرندر نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"کیوں میں کیوں چوٹی۔ میں نے کوئی انگور چرائے ہیں۔"

"میں نے کب چرائے ہیں۔ میں نے تو توڑے ہیں۔"

"توڑے ہیں تبھی تو چرائے ہیں۔"

"چل چل بہت باتیں نہ بنا۔"

"چیختے کیوں ہو۔ چوٹے کہیں کے۔"

"تو نہیں چوٹی جو کل میری گیند اٹھا لے گئی۔"

"تم چوٹے ہو تم نے انگور چرائے ہیں۔"

"اور وہ میری رنگدار دستوں والی رسی کس کے پاس ہے۔"

"میری لوڈو بھی تو تمہارے پاس ہے۔"
"لے لو اپنی لوڈو۔ دے دو میری رسی۔"
"تم پہلے میری تصویروں والی کتاب لاؤ"
"اور تم میری فونٹن پن کی سیاہی لاؤ"۔
"وہ تو ختم ہو گئی۔"
"تو وہ بھی گئی۔"
"کیوں وہ تمہارے پاس ہے "
"ہے ہی پر دوں گا نہیں۔"
"میں ممی سے کہوں گی۔"
"جاؤ کہو۔ میں کوئی تمہاری ممی سے دبتا ہوں۔"
"میری کتاب دے دو۔ نہیں تو میں تم سے بولوں گی بھی نہیں۔"
"نہ بولو — تمہاری کون خوشامدیں کرتا ہے۔"
"تم ہی کروگے دیکھ لینا"
"بڑی آئی خوشامدیں کرانے والی تم سی کئی دیکھی ہیں ہم نے" اور کہتے کہتے سرندر جھنجھلاتا ہوا اپنے بنگلہ میں چلا گیا۔ ارملا چند لمحہ تو وہاں کھڑی غصے سے سرندر کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر منہ پھیلائے اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

اپنے کمرہ میں پہنچ کر سرندر نے انگوروں کے خوشے ایک جانب میز پر رکھ دئیے اور کرسی پر بیٹھ کر چند لمحہ غصہ سے ہونٹ کاٹتا رہا۔ پھر بیقرار ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیکن وہاں بھی کروٹیں لینے کے سوا اس سے کچھ بن نہ آیا۔ اسے اس بات کا اتنا غم نہ تھا کہ وہ چوری کرتا پکڑا گیا ہے۔ اُسے تو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ ارملا اس سے روٹھ گئی ہے

اور وہ دل میں خوب جانتا تھا کہ ارملا کے بغیر اس کی طبیعت بیحد اچاٹ رہیگی لیکن اس کی خود دار طبیعت اُسے کسی بھی ایسی مصلحت آمیز صلح کی اجازت نہ دیتی تھی۔ جو کبھی بھی کسی پہلو سے تضحیک آمیز ثابت ہو۔

اِدھر ارملا کی یہ حالت تھی کہ وہ چند لمحہ تو دل پر جبر کئے بیٹھی رہی جب دیکھا کہ پانی سر سے گزر رہا ہے تو چپکے سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سرندر کے کمرہ تک پہنچ گئی۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ تو سرندر کا منہ پھیلائے پلنگ پر لیٹا پایا۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"سرندر"

لیکن سرندر سُن کر بھی خاموش رہا۔ ارملا نے دوسری بار پکارا

"سرندر"

اور گو سرندر کی طبیعت بولنے کو بیقرار تھی۔ اس نے مصلحت اسی میں سمجھی۔ کہ اب بھی خاموش رہا جائے۔

"سرندر" اب کی ارملا نے جرأت سے سرندر کے بازو کو چھوتے ہوئے پکارا۔

"کیوں کیا ہے"؟ سرندر نے ارملا کی جانب کروٹ لیتے ہوئے کہا

"میں تمہیں منانے آئی ہوں سرندر"

"ہم نہیں مانیں گے"

"دیکھو سرندر مجھ سے غلطی ہو گئی۔ معاف کر دو"!

"اوں ہونہہ۔ ہم کوئی تمہاری خوشامدیں کرنے والے ہیں"

"نہیں تم نہیں۔ میں جو تمہاری خوشامدیں کرنے والی ہوں"

"نہ جی تم پیچھے باتیں بناؤ گی"۔

"قسم لے لو جو کوئی بات کروں"۔

"اوں ہونہہ۔ ہم تو چھوٹے ہیں!"

"نہیں تم نہیں۔ میں چھوٹی ہوں۔ لو اب تو مان جاؤ۔ دیکھو تمہارے پاؤں پڑتی ہوں"۔

سرندر اب زیادہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری تصویروں والی کتاب لا دوں"۔

"نہیں مجھے نہیں چاہیئے۔ آؤ کھیلیں"۔

"کیا کھیلو گی"۔

"گھر گھر"

اور پھر اسی باغ کے اسی تنہا گوشہ میں وہی کھیل کھیلا گیا۔ اس دن اور آنے والے کئی دن۔ اور ان سب دنوں میں ارملا نے سرندر کو کبھی بھی خفا ہونے کا موقع نہ دیا۔ اور ایک دن آیا کہ دونوں خوب گلے مل کر ملے اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کبھی نہ بھولنے کا پیمان کرتے ہوئے انھوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور ہم راولپنڈی چل دیئے۔ سر جیت نے چلتے چلتے بھی ایک موقعہ نکال ہی لیا اور سرندر کو چاکلیٹ کا ڈبہ دینے کے بہانے اپنے کمرہ میں لے جا کر خوب خوب اسکے گال چٹا ٹر کئے۔

تیسرا باب

اسے خوش قسمتی سمجھئے یا بد قسمتی۔ ہمیں راولپنڈی میں کوئی اچھا بنگلہ کرایہ
ر نہ مل سکا۔ اس لئے ہمیں مجبوراً بوڑھ محلہ میں ایک بڑا سا مکان کرایہ پر لینا
ڑا۔ سرندر چونکہ ان دنوں میٹرک کی تعلیم پا رہا تھا۔ اور محلے کی گنجان آبادی
ں وہ سکون میسر نہ آتا جو مطالعہ کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اس لئے
تبدیلی اسے کچھ ناخوشگوار اور پریشان کن محسوس ہوئی۔ لیکن چونکہ میں
رغ التحصیل ہو چکا تھا اور ہما چاچاجی (سرندر کے والد) کا خیال تھا کہ یہیں
ج بازار میں مجھے منیاری کی ایک دکان کھول دیں گے۔ مطمئن تھا کہ یوں
ا گھر سے بہت قریب رہوں گا۔ مجھے بہت جلد ایک اچھا سا مہورت دیکھ کر
زوں موقعہ پر منیاری کی دکان کھول دی گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں
روبار چل نکلا۔ اور میں چاچاجی کی اس فیاضانہ امداد کے باعث ہمیشہ کے
، روزگار کے فکر سے آزاد ہو گیا۔ سرندر کے لئے بھی میرا منیاری کی دکان کھولنا

کچھ کم دلچسپی کا باعث نہ تھا۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ آئے دن اس کی رومالوں اور نکٹائیوں کی ضروریات بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور تیل تو اس نے کوئی کے بغیر اور کوئی استعمال میں لانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے بھی کبھی اس کی دلچسپیوں میں حارج ہونے کا خیال نہ ہوا۔ اور ایک طرح سے شاید یہ میری خود غرضی بھی تھی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ سرندر جسے مجھ پر ہر پہلو سے فوقیت حاصل ہے۔ کم از کم ان معمولی ضروریات کے لئے تو میرا دست نگر رہے شاید اس احساس برتری کو آپ لغو خیال کریں۔ اور اب تو مجھے بھی کبھی کبھی اپنے اس بودے پن پر ہنسی آتی ہے۔ بہرحال اس وقت تو مجھے اس فوقیت کا بُری طرح احساس تھا اور بارہا اس احساس کے ماتحت میں نے خود آ سے مُبلا کر سے نئے رومالوں اور نکٹائیوں کے نمونے دکھائے تھے۔

کچھ ہی عرصہ بعد میری راولپنڈی میں ایک متمول گھرانے میں سگائی ہوگئی اور اس کے چند ماہ بعد شادی بھی۔ سرندر ان دنوں دسویں کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔

شب عروسی اپنے آخری لمحوں پر تھی۔ ہلکی ہلکی سپیدی چہار سو پھیلتی جا رہی تھی۔ میں اپنے دل کے بچے کھچے ارمان نکال رہا تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ پہلے آہستہ۔ پھر قدرے زور سے۔ میں نے پریشان ہو کر رضائی سے منہ نکالا اور پوچھا کون ہے۔

"جی میں" سرندر نے دبی آواز میں کہا۔

اب مجھے اٹھنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں نے جلدی سے ساتھ کے پلنگ یعنی اپنے پلنگ کے بستر کو شکن آلود کیا۔ رضائی کو تمام بستر پر پھیلایا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ گویا صبح کی سپیدی اس کے لبوں پر ہی پھوٹ رہی تھی۔

"آؤ سریندر" میری رفیقہ حیات نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نمستے بھابی جی" اور میری موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ مستانہ وار چلتا ہوا میری رفیقہ حیات کے پلنگ کے قریب پہنچ گیا۔ پھر ایکا ایکی رُک کر خوفزدہ آواز میں کہنے لگا۔

" او بھابی ی ی ی ـــ تکیہ سے ادھر ہٹ جانا" جیسے اس نے کوئی خوفناک چیز تکیہ کے ساتھ دیکھ لی ہو۔

میری رفیقہ حیات ایک جانب ہٹ گئی۔ اس نے کامل سنجیدگی سے تکیہ اٹھا کر ایک جانب رکھا۔ نیچے سے مٹھائی کا لفافہ نکالا۔ اُسے کھولا۔ اور ایک گلاب جامن نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھئے بھابی جی۔ مٹھائی کا لفافہ تکیہ کے نیچے رکھنے سے تکیہ کا غلاف داغدار ہو گیا ہے۔ غنیمت سمجھئے کہ میں وقت پر پہنچ گیا اور لفافہ نکال لیا ورنہ چادر بھی خراب ہو جاتی۔" پھر برفی کے دو بڑے بڑے ٹکڑے منہ میں رکھ کر مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔ "بھابی جی۔ مٹھائی ہمیشہ پلیٹ میں ڈال کر باہر رکھی جاتی ہے"۔

ہم ابھی اس کی ظرافت پر ہنس رہے تھے کہ وہ قلاقند کا ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر مسکراتا ہوا دروازہ کی جانب چل دیا۔

"ٹھہرو سریندر" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔" یہ کیا کہ بس آئے اور چلے گئے۔ دو منٹ اپنی بھابی کے پاس تو بیٹھو!"

"جی بس پھر آؤں گا" اس نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن صبح صبح آئے کیسے۔ تم نے یہ بھی تو نہیں بتایا؟"

"جی بس آگیا" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔" میں نے کہا۔ کہ اگر دیر سے گیا تو پھر۔ تو پھر یہ مٹھائی......"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک شوخ مسکراہٹ اس کے چہرہ پر کھل اٹھی۔ اس کی آنکھیں۔ ایک عجیب ہی انداز سے جھکیں اور وہ ٹھٹھہ ہنستا ہنستا کمرہ سے باہر چلا گیا۔

۲

سرنادر کو خدا معلوم کون بتا دیتا تھا کہ آج مٹھائی آئینے کے پیچھے ہے اور آج پھل ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ہیں لیکن اب تک اس کی دست درازیاں صبح کے لئے مخصوص تھیں۔ بس علی الصباح وہ ہمارے لئے الارم کھلا دروازہ کھلا اور وہ سیدھا مٹھائی کی جانب بڑھا۔ ہاتھ بڑھایا۔ مٹھائی اٹھائی۔ اور مسکراتا ہوا کمرہ سے باہر چلا گیا۔ جیسے وہ خود ہی وہاں مٹھائی رکھ کر کسی کام کے لئے باہر گیا ہو۔ اور اب کام سے فارغ ہو کر مٹھائی لینے آیا ہو۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ ایک ہفتہ میں ہم سات مقام تبدیل کر چکے تھے۔ اور ایک بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہا تھا۔ لیکن ایک روز تو..."

اس شام بازار سے میں خاص طور پر نہایت عمدہ خطائیاں بنوا کر لایا تھا۔ اپنے کمرہ میں کپڑے اتارنے کے بعد میں نے انہیں نہایت احتیاط سے ایک بڑی سی تصویر کی پشت پر چھپا دیا تھا۔ اور خود کھانا کھانے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ میں چونکہ دکان سے دیر سے آیا کرتا تھا، اس لئے گھر کے دیگر افراد میرا انتظار کئے بغیر کھانا کھا کر فارغ ہو جاتے تھے۔ صرف میری رفیقۂ حیات میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ آج بھی میں نے

اُسے اپنا منتظر پایا۔ ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ سرندر مسکراتا ہوا کمرہ میں وارد ہوا اور کہنے لگا۔

"بھیّا میں نے ایک شعر موزوں کیا ہے۔"

"اچھا اب شاعری میں بھی قدم رکھنے لگے۔"

"جی بس کیا کیا جائے۔" اس نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"معدے کو خوراک زیادہ مل جائے تو خود بخود ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔"

میں اس کی اس تشبیہ کو کچھ نہ سمجھ سکا۔ لیکن اپنی بے بسی کو چھپانے کے لئے کہا۔

"اچھا سناؤ۔ دیکھیں تم نے کیسا شعر کہا ہے۔"

"بس بے حد مزیدار ہے۔"

"سناؤ گے بھی یا باتیں ہی بناتے رہو گے۔"

"سنئے۔ بس آپ تو خفا ہونے لگے۔" اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔

عرض کیا ہے کہ ؎

جس نے نہ کھائیں خطائیاں
وہ کیا کرے گا کمائیاں

میرے دل میں جھٹ سے کھٹک گئی۔ میں نے چاہا کہ اٹھ کر تصویر کے پیچھے دیکھ آؤں۔ وہ بھی میری نیت کو تاڑ گیا۔ اور ایک عجیب ہی انداز میں پچکارتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ — بیٹھ جائیے بھائی صاحب۔ آپ نے مطلع ثانی تو سنا ہی نہیں عرض کیا ہے کہ ؎

تصویر کے پیچھے خطائیاں   وہ ہم نے آج اڑائیاں

اور پھر زور سے قہقہہ لگاتا ہوا کمرہ سے باہر بھاگ گیا

۳

میری رفیقۂ حیات کو سرندر کی یہ معصوم سازشیں کچھ ایسی پسند آئیں۔ کہ وہ جان بوجھ کر سرندر کے لئے مٹھائی وغیرہ چھپا رکھتی۔ اور سرندر کو غدا دے۔ نہ اس صفائی سے مٹھائی پر ہاتھ صاف کرتا کہ ادھر وہ رکھ کر گئیں۔ اور ایک لمحہ کے بعد آکر دیکھا تو مٹھائی غائب۔ لیکن اب وہ اس کا بدلہ اتارنے لگ گیا تھا اور آئے دن بھابی کی تیل۔ صابن۔ پاؤڈر۔ لیونڈر۔ سرخی۔ بندہ وغیرہ سے تواضع کرنے لگا تھا۔ گو یہ سب بوجھ مجھ غریب پر ہی پڑ رہا تھا۔ اور ایک طرح سے وہی بات ہو رہی تھی کہ میاں جی کی جوتی۔ میاں جی۔ کے سر۔ تاہم میں خاموش تھا۔ کیونکہ وہ مجھے اس قدر عزیز تھا کہ میں اس کی بھابی کے سامنے اس کی کرکری نہ کرنا چاہتا تھا اور وہ بھی خوش تھیں۔ کیونکہ انہیں یہ اشیاء بے حد مرغوب تھیں۔ ان کے لئے یہ بات معنی نہ رکھتی تھی کہ یہ اشیا کہاں سے آرہی ہیں۔ بس صرف یہ کافی تھا کہ انہیں یہ اشیا مل رہی ہیں اور کمال فراغدلی سے۔

ایک دن جب میں دوپہر کا کھانا کھانے گھر آیا تو دیکھا کہ شریمتی جی ایک سپید بوسکی کے رومال پر تتلیاں کاڑھ رہی ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "آج یہ دیدہ ریزی کس لئے ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا" میری رفیقۂ حیات نے رومال سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے جواب دیا " ہم بھی سرندر کو کچھ تحفہ دیں گے"۔

"ہوں" میں نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا " تو یہ سرندر کی خاطر داریاں ہو رہی ہیں"

"جی" انھوں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"اور ہمارے لئے" آخر میں نے اپنی خود غرضی کا اظہار کر ہی دیا۔

"آپ کوئی بچہ ہیں" میری رفیقۂ حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گویا سولہ برس کا سرندر ابھی بچہ ہی تھا۔ میں مجبوراً خاموش ہو گیا۔ اور آپ ہی بتلایئے اس سے آگے کیا کہتا۔

میری کور ذوقی ملاحظہ فرمایئے کہ میں نے سرندر سے اس بات کا ذکر کر دیا۔ کہ اس کی بھابی اس کے لئے ایک ریشمی رومال پر بتیاں کاڑھ رہی ہے۔ گو ساتھ ہی میں نے اُسے منع کر دیا۔ کہ بھابی سے اس کا ذکر نہ کرے کیونکہ وہ اُسے ایکا ایکی متعجب کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ایک ہی شیطان تھا۔ بھابی سے تو اس نے میرے کہے کے مطابق نہ کہا۔ لیکن اُدھر اسکی بھابی کمرہ سے باہر ہوئی ادھر اس نے جھٹ سے اندر جا کر اس کی کاڑھنے والی پٹاری کو الٹ پلٹ کرنا شروع کیا۔ ایک دن وہ اسی الٹا پلٹی میں محو تھا کہ اتنے میں میری رفیقۂ حیات بھی کمرہ میں آوارد ہوئی اور سرندر کو یوں پٹاری کو الٹ پلٹ کرتا دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔ سرندر نے گھبرا کر پیچھے کی جانب دیکھا اور میری رفیقۂ حیات کو دیکھ کر بوکھلا کر رہ گیا۔

"اوہ ـــ بھابی ـــ میری تو جان ہی نکل گئی"۔

"کیوں کیا ہوا" میری رفیقۂ حیات نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے تمہارے پاؤں کی چاپ سن کر سمجھا کہ تم آگئیں اور مڑ کر دیکھا تو سچ مچ تم آگئیں"۔

میری رفیقۂ حیات بے اختیار ہو کر ہنس دی۔ پھر ہنسی پر قابو پا کر پوچھنے لگی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کرنے آئے تھے۔"

"یونہی چلا آیا تھا۔"

"یونہی تو چلے آئے تھے۔ یہ میری پٹاری کو کیوں الٹ پلٹ رہے تھے"

"کچھ لینا تھا۔"

"کیا۔"

"یہی تو مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

"سچ سچ نہیں بتاؤ گے۔"

"اب یاد آئے بھی۔ ٹھیرو سوچوں۔" اور اس نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں۔ وہ جو میری کیمسٹری کی کاپی ہے نا۔ وہ بڑی بڑی جس میں بیکر صراحی وغیرہ کی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ سمجھ گئیں۔"

"نہیں۔"

"اوہ تمہاری تو سمجھ ہی خراب ہے۔ ذرا ٹھیرو میں وہ کاپی لے آؤں۔"

"نہیں کاپی کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بات کرو۔"

"بس بات یہ ہوئی کہ اس کاپی کی سلائی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے کہا بھابی کی پٹاری سے ذرا سوئی دھاگا لے آؤں۔ اور . . . . ."

لیکن پیشتر اس کے کہ سرنادر فقرہ مکمل کرتا۔ مقابل کے مکان کی کھڑکی کھلی اور ایک ہلکی سریلی نقرئی آواز سنائی دی۔

"راج ——!" (میری رفیقۂ حیات کا نام)

میری رفیقۂ حیات نے پلٹ کر اس جانب دیکھا اور اپنی سہیلی کرشنا کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ سرنادر نے اس جانب رخ کیا اور پہلی بار برقِ حسن نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ کرشن کا اتنا

میری رفیقۂ حیات کی محبوب سہیلیوں میں سے تھی۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا۔ کہ اس سا لطیف حسن بہت کم دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

"کب آئیں"۔۔۔ میری رفیقۂ حیات نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہی تو آرہی ہوں"

"کون ہے" سرندر نے سنبھلتے ہوئے دبی آواز میں بھابی سے استفسار کیا

"میری سہیلی"

"کیا نام ہے؟"

"کرشن کانتا"

"نام تو مزیدار ہے"

"کیا کہتا ہے تمہارا دیور" وہی نقرئی آواز پھر سنائی دی۔

"کہتا ہے تمہاری سہیلی تو مزیدار ہے۔" میری رفیقۂ حیات نے شوخی سے جواب دیا۔

سرندر کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ اِدھر کسی نے جھینپ کر کھٹ سے کھڑکی بند کردی۔

اس کے دوسری دن بعد ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

میری رفیقۂ حیات کسی کام سے اپنے میکے گئی تھی۔ سرندر پھر اس کے کمرہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایکا ایکی مقابل مکان کی کھڑکی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ اور کھڑکی میں پھر اس برق وش مہ پارہ کو جلوہ افروز پایا۔

"سرندر جی ی ی ی۔۔۔" اس شعلہ رو نے عجیب انداز سے پکارا۔

"جی۔۔۔" سرندر نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"راج گھر ہے؟"

"جی نہیں وہ تو وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو تم اکیلے ہو۔"

"جی"

پھر کھٹ سے کھڑکی بند ہو گئی اور سرندر نئے سرے سے چھان بین میں مصروف ہو گیا۔ ابھی چند منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے جھٹ سے رومال پٹاری میں رکھ دیا۔ اور خود ڈریسنگ ٹیبل کے قریب کھڑا ہو کر بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سرندر جی ی ی ی — ایک ستار کی جھنکار کی طرح مضطرب آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے کمرہ میں قدم رکھا۔ سرندر نے تڑپ کر اس جانب رخ کیا اور ٹکٹکی باندھ کر رہ گیا۔

کرشن کانتا آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"راج گھر پر نہیں؟" کرشنا نے اس سادگی سے استفسار کیا۔ گویا یہ سوال وہ پہلی بار کر رہی ہے۔ سرندر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دلفریب لبوں کی فریب آمیز جنبش نے زور سے اس کے دل میں چٹکی لی ہے۔

"جی نہیں" — سرندر نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ہٹ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"اچھا" کرشنا نے کسلمندانہ انداز میں کہا اور پھر خود بھی اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی

ایک لمحہ کے لئے کمرہ میں لرزا دینے والا سکوت چھا گیا۔ سرندر کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے کسی نے بیدردی سے لغوزا کے تار کو

مضطرب کر دیا ہو جیسے کسی نے اس کے سینے میں سیماب رکھ دیا ہو۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کرشنا کے چہرہ پر ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا کہ اگر ایک لمحہ اور یہ شعلہ جوالہ حسن یونہی خاموش رہا۔ تو اس کا دل اس تیزی سے دھڑکے گا۔ کہ ممکن ہے وہ لبوں تک پہنچ کر اپنا سب بھید کھول ڈالے۔

"سرندر جی"۔۔۔ پھر وہی ملکوتی راگ سنائی دیا۔

"جی"۔۔۔ سرندر نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں"

دفعتاً سرندر کو ایک شوخی سوجھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک من اکیس سیر"

"کیا مطلب" بچاری کرشنا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی یہ میرا وزن ہے۔"

"ارے۔ اچھا اچھا" اور کرشنا بے اختیار ہو کر مسکرا دی۔ سرندر کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دور مندر میں ایکا ایکی بہت سی گھنٹیاں بجا دی ہوں۔ یا جیسے کوئی تیزی سے جلترنگ بجا رہا ہے۔

"آپ کی کیا خاطر کی جائے"۔ سرندر نے ایک لمحہ بعد پوچھا۔

"آپ یہیں بیٹھے رہیئے۔ بس"!

اور سرندر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ کہ اگر کرشنا نے ایک بار فقط ایک بار اس کی جانب پھر اُن سحر طراز نظروں سے دیکھ لیا تو وہ اس برق آسا حسن کی سحر انگیزیوں سے مسحور ہو کر اس کی گود میں گر پڑے گا۔

"آپ کی بھابی تو بیحد خوش نصیب ہے"۔ کرشنا نے مسکراتے ہوئے کہا

"بھابی آئے گی تو اس سے کہہ دوں گا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ کہتی تھیں۔ وہ بیحد خوش نصیب ہے۔"

"کیسے خوش نصیب ہے۔ یہ تو آپ نے پوچھا نہیں۔"

"اب بتا دیجئے۔"

"اس لئے کہ آپ اس کے دیور ہیں۔"

"بس؟"

"اور کیا یہ کم ہے؟"

"تب وہ بیحد بدنصیب ہے۔"

"کیسے؟"

"میں اس کی سب مٹھائی وٹھائی ہڑپ کر جاتا ہوں۔"

"بس؟"

"یہ کیا کم ہے؟"

"کاش کہ تم میرے دیور ہوتے۔"

"پھر؟"

"میں تمہیں ڈھیروں مٹھائی کھلاتی۔"

"اور اگر بدہضمی ہو جاتی؟"

"بدہضمی کیوں ہوتی میرے چاند کو۔" کہتے کہتے کرشنا نے بڑھ کر سرندر کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی نگاہوں سے نگاہیں ملا دیں۔ سرندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے نادانستگی میں وہ برقی تاروں سے چھو گیا ہے اس کی رگ رگ مضطرب ہو اٹھی۔ اور اس کی شریانیں اس طرح پھڑکنے

لگیں۔ گویا ابھی وہ اچھل کر جسم سے باہر آجائیں گی۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے دو چمکتی ہوئی بجلیاں نظر آئیں۔ دو ایسی بیقرار نگاہیں جو خدا معلوم کس جنم کی بھوکی تھیں اور اب اپنے شکار پر جم رہی تھیں۔ معاً اسے خیال گزرا۔ لوگ کہتے ہیں سانپ کی نگاہوں میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ان کی جانب ایک بار دیکھ لے تو پھر اس میں جنبش کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا سانپ کی آنکھوں میں اس سے بھی زیادہ مسحور کن طاقت ہوتی ہے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"سرندر جی"۔۔۔ کسی نے مخمور انداز میں کہا۔

"جی" سرندر نے اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کتنے پیارے ہیں"

سرندر خاموش رہا۔

"آپ کے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا"

سرندر اب بھی خاموش رہا۔ لیکن اس کا عضو عضو مضطرب ہو اٹھا۔ دفعتہً اُسے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اپنے کپکپاتے ہوئے لب اس کے لبوں سے لگا دئیے ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ آخر سانپ نے اپنا وار کر ہی دیا۔ لیکن اُسے حیرت تھی کہ یہ کیسا وار ہے جو بیک وقت تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ جس میں جذبات کو برانگیختہ کرنے کی تاثیر بھی ہے اور تسکین دینے کی بھی۔ وہ چند لمحہ ساکت رہا۔ پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"سرندر جی"۔۔۔ کسی نے جذبات سے مغلوب آواز میں پکارا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ دور کہیں کوئی ساحر مقدس آگ میں آہوتی ڈالتا ہوا منتر الاپ رہا ہے۔

اس نے دھیمی مدھم آواز میں جواب دیا "جی" اور پھر دفعتاً اسے کسی چیز کے حلق میں اٹکنے کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اپنا دماغ سن ہوتا محسوس ہوا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے گرد کی سب چیزیں دور بہت دور چلی گئی ہیں۔ اور اس سے میلوں دور بیٹھی ہوئی کرشنا کسی خلا سے اُسے پکار رہی ہے۔

"سرندر جی۔ کیا خفا ہو گئے ہو"

اس نے چاہا کہ کرشنا کو کوئی جواب دے۔ ایک آدھ بار اس کے لبوں میں کچھ جنبش بھی ہوئی لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیا مجھ سے بولنا پسند نہیں" کرشنا نے عجیب دلربانہ انداز میں پوچھا لیکن سرندر پھر بھی خاموش رہا۔ جیسے کسی نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔

"کیا میں چلی جاؤں"

اور سرندر کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اس کے دماغ پر زور سے ہتھوڑے کی ضرب لگائی ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر کرشنا کو پکڑ لے اور اُسے کھینچکر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا۔ تاکہ کسی صورت اس کی بے پناہ دھڑکن میں کچھ تو کمی ہو۔ لیکن اس کے ہاتھوں نے جنبش سے انکار کر دیا۔ اور وہ اسی طرح بے حس بیٹھا رہا۔ جیسے وہ انسان نہیں ایک سنگ مرمر کا مجسمہ ہے۔ پھر یکایک اُسے تمام دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ کسی کے پاؤں کی اضطراب انگیز چاپ سنائی دی۔ پھر سیڑھیوں سے اترنے کی صدا۔ اور دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا کہ چہار سو تاریکی چھا گئی ہے۔ اور زندگی کی وہ جوت جس نے کمرہ کو منور کر رکھا تھا یکا یک

بُجھ گئی ہے۔ وہ سر تھام کر رہ گیا۔ اور اس نے زور سے آنکھیں موند لیں چند لمحہ بعد جب اُس نے آنکھیں کھولیں، تو اُسے وہ کمرہ بے حد سنسان محسوس ہوا۔ اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ محفل اجڑ چکی تھی، جس میں وہ چند لمحے پہلے چہک رہا تھا۔ وہ نغمہ بند ہو چکا تھا۔ جس نے اُس کے دل کے حساس تاروں کو مضطرب بنا دیا تھا اور وہ ستار ٹوٹ چکا تھا جس سے ہلکی ہلکی نغمہ کی تانیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس نے بھاگ کر برتنوں میں جھانکا لیکن وہ بالکل خالی تھیں۔ برآمدہ بھی خالی تھا۔ ڈیوڑھی بھی خالی تھی۔ فقط کسی کے پاؤں کی چاپ ابھی تک اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ یا شاید اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

(x)

چوتھا باب

چند یوم گزر گئے۔

ایک دن میں دوپہر کا کھانا کھانے گھر آیا تو حسب معمول اپنی رفیقۂ حیات کو اپنا منتظر نہ پا کر کچھ بے چین سا ہو گیا۔ میں کھانا کھانے کے بجائے سیدھا اس کے کمرہ میں پہنچا۔ دیکھا تو وہ نہایت بے دردی سے کمرہ کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ رہی ہے۔

"خیر تو ہے" ـــــ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"ہاں خیر ہے"۔ اس نے میری جانب مڑنے کی ضرورت محسوس کئے بغیر کہا "ابھی ابھی رومال ختم کر کے تہ کر کے پٹاری میں رکھ کر گئی اور اب آ کر دیکھتی ہوں تو رومال کا کہیں نشان تک نہیں۔ سب چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھ بیٹھی۔ معلوم نہیں کدھر غائب ہو گیا۔"

"دراز دیکھے؟"

"جی تین دفعہ"
"کپڑوں کی الماری"
"وہ کھلی پڑی ہے"
"اور تمہاری پٹاری"
"وہ الٹی رکھی ہے"

اب صرف ایک ہی بات باقی رہ گئی تھی کہ کہیں میری رفیقۂ حیات رومال کو ڈریسنگ ٹیبل یا چھوٹی الماری کے اوپر رکھ گئی ہو۔ اور وہ ہوا کے جھونکے سے اڑ کر ان کے عقب میں گر گیا ہو۔ اس لئے میں فرنیچر کو اپنی جگہ سے سرکانے لگا۔

"کیوں بھیا" ——— مسز نادر نے کمرہ میں قدم رکھتے ہوئے کہا "یہ آپ دونوں کو صاف ستھرے کمرے سے چڑ ہے کیا؟"

"تم آگئے ——— بس اب رومال کو ملنا ہوگا تو بھی نہ ملے گا" میں نے بیزاری سے کہا۔

"رومال؟ ——— تو کیا صرف ایک رومال کی تلاش میں یہ دردسری ہو رہی ہے۔"

"ہاں مسز نادر" ——— میری رفیقۂ حیات نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے کیا سپید بوسکی کا رومال دیکھا ہے؟"

"جی ——— وہ جو آپ میرے لئے کاڑھ رہی تھیں" مسز نادر نے کمال سادگی سے کہا۔

"تمہیں کس نے کہا" میری رفیقۂ حیات نے متعجب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی بس معلوم ہو گیا" اس شیطان نے معصوم سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

اور ساتھ ہی میری جانب آنکھ سے اشارہ بھی کر دیا۔

"ہوں ـــــ یہ بات ہے" میری رفیقۂ حیات نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر جھکنے سے قریب ہی پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے سٹ پٹا کر منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

ایک ہی لمحہ بعد میری رفیقۂ حیات نے پھر کہا

"لیکن وہ گیا کہاں"!

"جی بس جس کا تھا وہ لے گیا" اس نے پاکٹ سے رومال نکال کر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا "آپ کیوں فکر کر رہی ہیں"!

"اچھا۔ اچھا" میری رفیقۂ حیات نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں مل گیا۔ بس میں یہی چاہتی تھی۔"

لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کھسیانی ہنسی کے پس پردہ اس کی خو سرندر کو رومال پیش کرنے کی آرزو کراہ رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ چونکہ میری ہی وجہ سے ہوا تھا۔ اس لئے میں عرق ندامت میں غرق ہوا جاتا تھا۔ میں نے جھکنے سے کھسک جانے میں ہی مصلحت سمجھی۔ اور شادی کے بعد آج پہلی دفعہ اکیلے ہی کھانا کھا کر دکان کی جانب چل دیا۔ ڈیوڑھی سے گذرتے ہوئے مجھے ساوتری ملی۔ اس نے نہایت پیار سے کہا "بھائیا جی نستے ـــــ" لیکن میں کچھ اتنا رنجیدہ خاطر ہو رہا تھا کہ میں نے بیزاری سے نستے کا جواب دیا۔ اور جلدی سے ڈیوڑھی سے باہر ہو گیا۔

ساوتری میری رفیقۂ حیات کی ماموں کی لڑکی تھی اور گزشتہ چند دنوں سے میری رفیقۂ حیات گھر میں یہ کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح کہہ سن کر ساوتری کو سرندر سے بیاہ دے۔ ساوتری اس امر سے بخوبی آگاہ تھی۔

اور شاید اسی جھجک کے باعث گذشتہ چند دنوں سے وہ ہمارے گھر نہ آئی تھی۔

ساوتری کے کمرہ میں قدم رکھتے ہی میری رفیقۂ حیات نے کہا۔

"کیوں ساوتری اتنے دنوں کہاں رہی۔"

"بس ایسے ہی نہ آسکی" ـــــ ساوتری نے سادگی سے کہا

"واہ بھابی"ـــــ سرندر نے بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا۔" یہ تمہاری اچھی بہن ہے۔ جو کئی کئی دن تم سے ملنے ہی نہیں آتی۔"

"سنا ساوتری کیا کہہ رہا ہے سرندر"

"جی"

"اب بتاؤ تمہیں کیا سزا دی جائے۔"

"آپ کے گھر آئی ہوں۔ جو آپ کا جی چاہے سزا دیں۔"

"بھابی"ـــــ سرندر نے پھر دخل دیتے ہوئے کہا۔" آپ چانٹے مارنے چاہیں تو ناک میں پکڑ دوں گا۔"

"اوں ہونہہ"

"پھر کیا بچاری سے کان پکڑواؤ گی۔"

"میرا جو جی چاہے کروں۔ تم کیوں پیچھے پڑ رہے ہو میری بہن کے۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ پیچھے کہاں پڑ رہا ہوں ـــــ سامنے کھڑا ہوں۔"

"اچھا سامنے کھڑے ہو بابا" میری رفیقۂ حیات نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اب یا تو چپکے سے بیٹھ جاؤ یا اپنے کمرہ میں چلے جاؤ۔"

"چلا جاؤں گا پہلے تم ساوتری کے ایک دو تڑاتڑ لگا تو دو۔"

"پھر چلے جاؤ گے۔"

"ہوں"

"تو پھر لاؤ سوئی ٹ"

"سوئی ٹ ــــ" سرندر نے کمرہ میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ سوئی ٹ تو یہاں ہے نہیں ــــ ہاں یہ میرا بازو ہے ــــ دو منٹ کے لئے اسے ہی سوئی ٹ سمجھ لو ــــ" کہتے کہتے سرندر نے اپنا بازو آگے بڑھا دیا۔

میری رفیقۂ حیات اس کی اس جسارت پر کھلکھلا کر ہنس دی لیکن ساوتری نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور سرندر آپ ہی آپ ایک جانب منہ کر کے مسکرانے لگا۔ شاید وہ خیال کر رہا تھا کہ اگر اس کی بھابی ایک لمحہ کے لیے اس کی بات مان کر اس کے ہاتھ کو ہی سوئی ٹ تصور کر لے۔ تو کم از کم وہ ساوتری کے گداز جسم کے مس سے ہی لطف اندوز ہو جائے اے کاش۔ وائے اے کاش۔

اس دن تقدیر سے باتوں ہی باتوں میں بہت دیر ہو گئی۔ اور شام کا دھندلکا چہار سو پھیلنے لگا۔ ایسے میں چونکہ ساوتری کو تنہا بھیجنا مناسب نہ تھا۔ اسلئے میری رفیقۂ حیات نے یہی بہتر خیال کیا کہ سرندر کو ساوتری کے ہمراہ بھیج دیا جاوے۔ یا شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ دونوں علیحدگی میں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیں تاکہ ان کا عندیہ معلوم ہو جائے۔

دوسرے دن میری رفیقۂ حیات خود ساوتری کے گھر گئی اور اس سے کرید کرید کر باتیں پوچھنے لگی۔ ساوتری پہلے تو کچھ ہچکچاتی رہی پھر کہنے لگی۔ "آپ کے گھر سے نکل کر وہ (سرندر) آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ کتنا راستہ ہی چلتے گئے۔ نہ انھوں نے مجھے بلایا نہ میں نے ہی کوئی بات کی۔ بس سر نیچا کئے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ آخر تنگ آکر میں نے کہا۔

"آپ بہت آہستہ چلتے ہیں"

"جی" ـــــ انھوں نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو آپ کے لئے چل رہا ہوں۔ ورنہ میں تیز چلوں تو آپ پیچھے رہ جائیں۔"

"میں تیز چل سکتی ہوں" ـــــ میں نے دبی آواز میں کہا۔

"اچھی بات ہے" ـــــ اور وہ تیز تیز چلنے لگے اور بہن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنے تیز چلیں گے۔ میں تو چند لمحوں میں ہی گھبرا گئی۔

"جی ی ـــــ!" میں نے دبی آواز میں پکارا۔ اور وہ میرا اشارہ سمجھتے ہی رک گئے۔ اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے شرما کر نظریں نیچی کرلیں۔ وہ کہنے لگے۔

"اب میں بالکل آہستہ چلوں گا"

"کیوں"۔ میں نے دبی آواز میں پوچھا۔

"گھر جو قریب آگیا ہے" انھوں نے کچھ عجیب انداز میں کہا۔ اور میں نے جو نگاہیں اٹھا کر ان کے چہرہ کی جانب دیکھا تو میرا دل سینہ میں بلیوں اچھلنے لگا۔ میں تو یہی سمجھی کہ ابھی مجھے بازو سے پکڑ کر سینہ سے لگا لیں گے لیکن نہیں وہ اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے گئے اور پھر گھر آگیا

سرندر سے پوچھنے کا فرض میرے سپرد ہوا۔ میں نے سب سے پہلا یہی ذریعہ سمجھا۔ کہ اس سے ساوتری کے تاثرات حرف بحرف بیان کردوں۔ وہ پہلے تو سنجیدگی سے سنتا رہا۔ پھر جب میں کہہ چکا تو مسکرانے لگا۔ میں نے سبب دریافت کیا تو کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں خدا جانے کیوں اتنی باریک میں

واقع ہوئی ہیں مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ گھر کے قریب پہنچتے ہوئے ایک دو بار جاودتری کا ہاتھ میرے ہاتھ سے اس طرح چھوا کہ میں سمجھا کہ وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے۔ پھر ایک بار میں نے چپکے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زور سے دبا دیا۔

۲

چند دن سے سرندر کے والد کی طبیعت کچھ علیل تھی لیکن کچھ اتنی تشویشناک حالت بھی نہ تھی کہ ہم سمجھتے اس بیماری کا اتنا ہولناک انجام ہوگا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایکا ایکی ایک روز سرندر کے والد ہمیں ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ گئے اور گھر کا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ کہاں تو وہ کسی اچھے بنگلہ میں اٹھ جانے کا خیال۔ اور کہاں اب یہ سوچا جانے لگا کہ اس مکان کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ اس کا کرایہ چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ سرندر کی عجیب ہی حالت تھی۔ چاچا جی کی موت سے میرا یہ حال تھا کہ میں روتے روتے بے حال ہوا جاتا تھا گھر کے چھوٹے بڑے سب کہرام مچا رہے تھے۔ لیکن وہ خاموش تھا خاموش اور بے حس بس پتھرائی آنکھوں سے کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ یا زمین پر نظریں گاڑے رہ کر اپنا ہونٹ کاٹنے لگتا تھا کتنے دن اس نے کسی سے بات تک نہ کی۔ لوگ جوق در جوق افسوس ظاہر کرنے آئے۔ اس نے سب کی سنی لیکن اپنی ایک بھی نہ کہی کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو سر ہلا دیا۔ ورنہ خاموش ایک جانب نظریں گاڑ دیں۔ دن میں کئی کئی بار وہ اٹھ کر والد کے کمرے میں جاتا اور جب بھی واپس آتا اس کا چہرہ پہلے سے زرد ہوتا۔ یوں ہی دن گزرتے گئے اور اس کی بے حسی بڑھتی گئی۔

اُن ایام میں نوشہرہ سے ہماری ماسی دماؤسی) صاحبہ بھی ماتم پرسی کیلئے آئی ہوئی تھیں۔ سمندر کی بے حسی انہیں بھی تشویش ناک محسوس ہوئی انھوں نے سمندر کی والدہ کو ترغیب دی کہ سمندر کو کچھ عرصہ کیلئے ان کے ہمراہ نوشہرہ بھیج دیا جائے۔ یوں بھی گرمیوں کی چھٹیاں قریب تھیں۔ اس لئے اس کی پڑھائی میں ہرج ہونیکا اندیشہ نہ تھا۔ یہ تجویز سب نے لپند کی۔ اور چند دن بعد سمندر کو اسکی ماسی کے ہمراہ نوشہرہ بھیج دیا گیا۔ لیکن یہاں بھی اس کی بے حسی برقرار رہی اور ہماری ماسی کی سب کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح اِدھر اُدھر پھرتا۔ جو کام کہا جاتا کر دیتا اور اس سے آگے بس۔ وہی ندیدا سمندر تھا۔ لیکن اب پھلوں کی پلیٹ اس کے آگے رکھ کر کہنا پڑتا تھا کہ کھاؤ۔ تب کہیں وہ کوئی چیز اٹھا کر منہ میں ڈالتا تھا۔ تاش اس کے ہاتھ میں دی جاتی کہ بانٹو اور وہ بانٹ دیتا۔ گراموفون اس کے آگے کرسی پر رکھا جاتا اور بار بار بجانے کیلئے کہا جاتا۔ تب کہیں وہ ایک آدھ ریکارڈ بجا دیتا۔ ایسے ہی میں ایک روز پرانے ریکارڈوں کے ڈبہ میں اس کی نگاہ ایک ریکارڈ پر پڑی اور ایکا ایکی اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے ماضی کی دلربا ساعتیں نگاہوں کے آگے گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی سرجیت کا دلفریب چہرہ اسے اپنے چہرہ پر جھکتا ہوا نظر آیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ پھر سے وہی کھلنڈرا سمندر ہو گیا ہے۔ ٹماٹروں کا بھوکا۔ چاکلیٹ کا دیوانہ۔ اس نے ریکارڈ ڈبہ میں رکھ دیا اور ڈبہ ایک جانب سرکا دیا۔

"ماجی سی" — اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "میں آج پشاور جاؤں گا"

"کیوں بیٹا کیا اتنی جلدی ہم سے جی بھر گیا"

"جی نہیں۔ میں تو ایسے دو ایک روز کے لئے گھومنے جاتا ہوں"!
"کب آؤ گے"؟
"زیادہ سے زیادہ سوموار تک"۔

۳

سرندر جب پشاور کے اسٹیشن پر اترا تو اس کے دل میں جذبات کا ایک ہنگامہ برپا تھا وہ تیز تیز قدم رکھتا ہوا گیٹ پر ٹکٹ دے کر باہر ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ سرجیت سے ملنے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے قلی سے سوٹ کیس تانگہ میں رکھوا دیا۔ تانگہ والہ کو بنگلہ کا پتہ دیا اور پھر اپنے خیالات میں الجھ گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ سرجیت اس وقت کس حالت ہوگی۔ شاید وہ نہا دھو کر برآمدہ میں بیٹھی بال سکھا رہی ہوگی۔ اور سورج کی کرنیں چھن چھن کر اس کے چہرہ پر رقص کر رہی ہوں گی یا شاید وہ قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے لمبے لمبے بالوں کو بل دے کر پیشانی کے اوپر ایک دلکش ابھار کی صورت میں آراستہ کر رہی ہوگی۔ اُف وہ نظر فریب ابھار جو ایک ناتمام بوسہ کی صورت میں اس کے بالوں پر رقص کر کے رہ جاتا ہے۔ اس نے خیال کیا۔ آج وہ اس ناتمام بوسہ کو مکمل کر کے چھوڑے گا۔ اس کے بالوں کی ابھری ہوئی الجھنوں کو سلجھا کر رکھ دے گا۔ وہ مجھے دیکھ کر کس قدر مسرور ہوگی۔ مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے گی۔ اُف وہ گداز سینہ ایکا ایکی اسے اپنے سینہ میں ایک تناؤ سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے زور سے سانس اندر کھینچا اُسے اپنا جسم پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ آج میں سرجیت کے دل و دماغ پر چھا جاؤں گا۔ اس کے انگ انگ پر پھیل جاؤں گا۔ اور اُسے

اپنے فراخ سینہ میں جذب کر لوں گا۔ کبھی وہ مجھے ارملا سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ آج میں اُسے تمام دنیا سے چھپا لوں گا۔ ارملا اور اُسے اپنے دل کے ایک گوشہ میں یک خوشگوارسی خلش محسوس ہوئی۔ اور پھر پھیلتے پھیلتے اس کے تمام جسم پر چھا گئی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ مجسم اضطراب تھا۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا۔ اپنے بنگلہ کے پھاٹک کے قریب ارملا اُسے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

آؤ سرندر گھر گھر کھیلیں۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ!!!

بابو جی تحصیلدار صاحب کا بنگلہ آگیا۔ کوچوان نے کہا۔ اور سرندر اس خواب بیداری سے چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے کوچوان کو کرایہ دیا۔ سوٹ کیس اتارا اور بجائے اس کے کہ تحصیلدار صاحب کے بنگلہ کی جانب رخ کرتا ارملا کے بنگلہ کی جانب بڑھا۔ لیکن گیٹ پر ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ گیٹ کے ایک جانب بورڈ آویزاں تھا۔

بی۔ کے۔ کپلا

ایس۔ ڈی۔ او

اُسے اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ سوٹ کیس اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔

بابو جی۔ تحصیلدار صاحب کا بنگلہ تو اس جانب ہے۔ اس بنگلہ میں تو نہرو الے صاحب رہتے ہیں۔

"اوہ اچھا ۔۔۔ اچھا" سرندر نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ پلٹ کر دیکھا۔ تو کوچوان تانگہ موڑ کر اب واپس لوٹ رہا تھا۔ اس نے سوٹ کیس اٹھایا۔ اور اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے تیز تیز قدم رکھتا ہوا۔ سرجیت کے بنگلہ میں داخل ہو گیا۔ دروازہ پر ہی اسے حالی مل گیا۔

ہریا ---- اوہریلے ---- سرندر نے پکارا

کون - بابوجی - چھوٹے بابوجی --- آپ --- مالی نے بوکھلاتے ہوئے کہا -
پھر سوٹ کیس سرندر کے ہاتھ سے لیکر اُسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اور خود
سردار صاحب کو بلانے کے لئے چلا گیا - ایک بار پھر سرندر اپنے ہی خیالات میں
محو ہوگیا - وہ سوچنے لگا - دیکھیں سب سے پہلے مجھ سے کون ملنے آتا ہے - شاید
سرجیت - اور کیا معلوم کہ سب اکٹھے ہی آجائیں - کاش کہ سرجیت اکیلی آئے -
اور اس نے تصور میں دیکھا - کہ سرجیت ایک بیقرار آرزو کی طرح دروازہ کو
زور سے چوپٹ کھولتی ہوئی بھاگتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی ہے -

معاً دروازہ کھلا اور سرجیت کی ماں اور سردار صاحب کمرہ میں وارد ہوئے
سرندر کی مایوسی نے دیکھا کہ سرجیت ان کے ساتھ نہیں -

" ارے سرندر " --- سرجیت کی ماں نے کہا " کب آئے بیٹا "

" نمستے چاچی جی --- نمستے چاچا جی ---- سرندر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے
اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا " ابھی آہی رہا ہوں "

" جیتے رہو بیٹا " سرجیت کی ماں نے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے
ہوئے کہا " کیسے آنا ہوا " اور پھر خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی - قریب ہی ایک
کوچ پر سردار صاحب بھی نیم دراز ہو گئے -

جی بس آہی گیا " سرندر نے نگاہیں نیچی کئے ہوئے جواب دیا " ویسے تو
نوشہرہ تک آیا تھا - جی چاہا آپ کے درشن کرتا جاؤں - بس پھر رک نہ سکا " -

" کتنا اچھا ہے سرندر بیٹا " سرجیت کی ماں نے سردار صاحب کی جانب
نگاہیں پھیرتے ہوئے کہا " یونہی تو نہیں - ہماری سرجیت ہر وقت سرندر سرندر
کہا کرتی تھی " کہتے کہتے سرجیت کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں -

"آپ اداس کیوں ہوگئیں چاچی جی" سرندر نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا"
"یونہی بیٹا" سرجیت کی ماں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا" سرجیت کی یاد آ گئی تھی"

"سرجیت خیر سے تو ہے" سرندر نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"بیٹا وہ تو ڈوبتے ہوئے ہمیں منجدھار میں چھوڑ گئی" کہتے کہتے سرجیت کی ماں کی آنکھیں امڈ آئیں اور وہ آنچل سے منہ ڈھانپ کر خاموش آنسو بہانے لگی۔

سرندر کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے تیز نوکیلا خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا ہے۔ اس نے تلملا کر سرجیت کی والدہ کی جانب دیکھا اور پھر گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں چند لمحہ کے لئے اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اسے ہر چہار سو تاریکی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایکا ایکی اس تاریکی میں سے سرجیت کا چہرہ اٹھتی ہوئی آرزو کی طرح نمودار ہوا۔ سرندر نے دیکھا۔ سرجیت حسرت بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہی ہے۔ اس کے لب کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن اُن سے قوتِ گویائی چھن چکی ہے۔ اسکی نگاہیں کچھ پیغام دینا چاہتی ہیں لیکن اُن میں جنبش کی طاقت باقی نہیں۔ اور اس بے بسی اور لاچاری نے اس کی رگ رگ میں اضطراب بھر رکھا ہے۔ سرندر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینہ میں ڈوب رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دوسرے ہی لمحہ جب اس نے سرجیت کی ماں سے افسوس ظاہر کرنے کے لئے زبان کھولی تو اُسے اپنا گلا روندھا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چاچی جی۔ یہ تو آپ نے بہت منحوس خبر سنائی" اور پیشتر اسکے کہ وہ کچھ اور کہے ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ اس نے سر کو کرسی کی

پشت پر ڈال دیا۔ اور ڈبڈبائی آنکھیں ایک جانب چھت پر گاڑ دیں۔ چند لمحے کے لئے کمرہ میں موت کا سا سکوت رہا۔ سرجیت کی ماں پیہم اشک بہانے میں مصروف رہی۔ سردار صاحب بدستور خاموشی سے نیم دراز رہے اور سرندر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے چھت کی کڑیاں گننے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آخر اس سکوت کو سردار صاحب نے توڑا۔ انھوں نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"سرندر کے لئے چائے تو منگوائی ہوتی"

"اوہ" سرجیت کی ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا" سرجیت کی باتوں میں چائے کا بھی خیال نہ رہا" کہتے کہتے وہ دروازہ کی جانب بڑھی۔

"نہ جائیے چاچی جی"—— سرندر نے روکتے ہوئے کہا۔" مجھ سے اب چائے نہ پی جائے گی"

"ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے" سرجیت کی ماں نے شفقت آمیز نظروں سے سرندر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا" ہم نے کیا کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ کہ تم چائے نہ پیوگے" اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی

سرجیت کی ماں کے چلے جانے کے بعد ایک دفعہ پھر کمرہ میں ہولناک سکوت نے تسلط جما لیا۔ سردار صاحب قدرتاً خاموشی پسند واقع ہوئے تھے اور سرندر کا کچھ بولنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ اس کا دل غم کے ایک ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ سرجیت کی یاد رہ رہ کر اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔ ایکا ایکی اُسے یوں محسوس ہوا کہ سرجیت اس کے پہلو میں بیٹھی اُسے سیب چھیل چھیل کر کھلا رہی ہے اس نے ہلکے بادامی رنگ کی سنہری بارڈر والی ساڑھی زیب تن کی ہوئی ہے۔ اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی ہے۔ یکایک ایک شوخ مسکراہٹ

اس کے چہرہ پر کھل اٹھتی ہے اور وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیار بھرے لہجے میں کہتی ہے۔

"کہو سرجیت"

اور وہ کہتا ہے شرجیت

"کہو سنگ"

"شنگ"

"سونا"

"شونا"

اور ابھی وہ اچھی طرح سونا کہہ بھی نہیں چکتا کہ وہ اسے جلدی سے بازو سے کھینچ کر اپنے سینے سے لپٹا لیتی ہے اور اس کے لب و رخسار پر بے انداز بوسے دے ڈالتی ہے "آہ سرجیت ـــــ اس کا وہ پیار سے منہ بنا کر کہنا "بش" ـــــ اور اسکا جی چاہا کہ کاش وہ اُسے پھر اسی انداز میں ایک بار فقط ایک بار "بش" کہہ سکے۔ معاً اُسے اپنے قریب سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُسے یوں وہم ہوا جیسے سرجیت کسی معجزے کے زیر اثر عالم بالا سے کھنچتی ہوئی اس کے پہلو میں آگئی ہے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن سرجیت کی بجائے خادم کو تپائی پر چائے کا سامان رکھتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں کٹ کٹا گیا۔ اپنے تصور کا اتنا حسرت ناک مآل اُسے صبر آزما محسوس ہوا۔ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ اور ایک پر درد نگاہ کوچ کی خالی جگہ پر ڈالی۔ آہ یہ وہی کوچ تھا جس پر بیٹھ کر سرجیت اُسے سیب و آڑو چھیل چھیل کر کھلاتی رہی تھی۔ اور آج یہ تپتی ہوئی چار جیسے شاید اس کے دل کی جلن گرما رہی تھی اور شاید یہ اس کی ہی آتش دیدہ آرزوؤں کا دھواں تھا۔ جو کیتلی سے اُبھر اُبھر کر فضا کو محبوس

بنا رہا تھا۔ اس نے پیالی میں چار انڈے ملتے ہوئے خیال کیا اس پگھلے ہوئے لاوا کو سینے میں انڈیل لینا ہی اچھا ہے۔ جلتی ہوئی آرزوؤں کو جلا کر راکھ کر دینا ہی بہتر ہے تاکہ ان میں زندگی کی معمولی سے معمولی رمق بھی باقی نہ رہے۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟" سرجیت کی ماں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"سوچنا کیا ہے چاچی جی۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ سرجیت ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی ہے۔"

"ہمارے بھاگ کھوٹے تھے ورنہ یہ کوئی اس کے مرنے کی عمر تھی۔"

"پر ایکا ایکی کیا ہو گیا اُسے؟"

"بس موت آ گئی بیٹا۔ ابھی اس کی شادی کئے پورے دو ماہ بھی تو نہ ہوئے تھے۔ اس کے کرموں میں شاید سسرال جانا بدا نہ تھا۔ دو دن بخار ہوا اور میری پھول سی سرجیت مرجھا کر رہ گئی۔"

"بس صرف دو دن بخار رہا؟"

"ہاں بیٹا!" سرجیت کی ماں نے آنچل سے امڈتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ویسے تو جب سے شادی ہوئی تھی کچھ اداس سی رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا اسکا کچھ کھو گیا ہے۔ مرنے سے دو دن پہلے باجا بجانا چاہا۔ میں خوش ہوئی کہ شاید اسی صورت اس کا جی بہلے۔ بڑے شوق سے باجے کو چابی دی۔ سوئی لگائی اور ریکارڈ صاف کر کے لگانا ہی چاہتی تھی کہ ریکارڈ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گرتے ہی دو ٹکڑے ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ باجا بند کر کے ایک جانب دھکیل دیا اور خود پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ میں نے کہا "پگلی ہوئی ہے سرجیت۔ کیا ہوا جو ایک ریکارڈ ٹوٹ گیا۔" کہنے لگی۔ "ماجی آپ کیا جانیں۔ مجھے یہ ریکارڈ کتنا پیارا تھا۔ بس دوسرے دن بخار ہو گیا اور اگلے

روز جل بھی بسی۔ آہ سرجیت تیری موت مجھے کیوں نہ آئی۔" کہتے کہتے سرجیت کی ماں آنچل سے چہرہ ڈھانپ کر خاموش آنسو بہانے لگی۔

"صبر کیجئے چاچی جی" سرندر نے دنیا داری کے طور پر کہا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود اسکا گلا بھر آیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ تنہائی میں بیٹھ کر خوب جی بھر کر روئے۔ چار کی پیالی سے ابھی اس نے چند گھونٹ ہی لئے تھے لیکن اب اسکا جی اُسے دیکھنا تک نہ چاہتا تھا۔ اس نے خادم کو سامان اٹھالے جانے کو کہا۔ اور خود ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر بیزاری کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"تم نے تو کوئی چیز تک چھوئی نہیں بیٹا" سرجیت کی ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کچھ پیسٹری تو کھائی ہوتی۔"

"بس چاچی جی۔ مجھ سے اب کچھ نہ کھایا جائے گا۔ میں نے پیسٹری کھائی تو سرجیت کی روح مجھے کبھی معاف نہ کرے گی۔"

"تم جانو بیٹا۔" سرجیت کی ماں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کچھ کھا لیتے تو اچھا ہی تھا۔"

اب راولپنڈی ہی پہنچکر کچھ کھاؤں گا۔" سرندر نے غمناک لہجہ میں کہا۔ "میں آج شام کو چلا جاؤں گا چاچی جی۔"

"نہ بیٹا" سردار صاحب نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا اب یہاں آئے ہو تو چند دن تمہیں رہنا ہی پڑے گا۔ اور کچھ نہیں تو تمہیں دیکھ کر تمہاری چاچی کا دل تو بہلا رہے گا۔"

"آپ کا حکم مجھ سے ٹالا نہیں جائے گا چاچا جی۔ پر یہاں رہ کر تو میرا غم سے بُرا حال ہو جائے گا۔"

پھر بھی دو ایک دن تو تمہیں یہاں رہنا ہی چاہیئے۔" سرجیت کی ماں

نے قفل دیتے ہوئے کہا۔ ”سرجیت ہوتی تو وہ تمہیں ہفتوں نہ جانے دیتی“

”آپ کہتے ہیں تو آج کے دن رہ جاتا ہوں لیکن کل مجھے نہ روکئے گا چاچی جی۔“

”کل آنے پر کل کی بات دیکھی جائے گی۔ آج تو تم اپنے لئے سرجیت کا کمرہ ٹھیک کر لو۔“

۴

سرجیت کے کمرہ میں قدم رکھتے ہی سریندر ٹھٹکا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے سرجیت مسکراتی ہوئی اس کے استقبال کے لئے بڑھ رہی ہے۔ اسکا دل زور زور سے سینہ میں دھڑکنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ خود بخود سرجیت کی جانب پھیل گئے اور اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔

سر——————سرجیت—————— اور

اس کے پاؤں اضطراری طور پر اس جانب بڑھنے لگے۔ جس طرف سے سرجیت اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا جوش سرد ہو گیا۔ اس کے پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کمرہ کے بیچوں بیچ قالین پر بیٹھ گیا۔ سرجیت جسے اس نے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تھا بدستور وہیں ساکت و سامت کھڑی تھی۔ اسکا دایاں پاؤں آگے بڑھا ہوا تھا۔ اسکے چہرہ پر وہی دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو آجتک سنسان راتوں کی بے چینیوں میں اس کے لئے فانوس راہ بنتی چلی آئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں پر ایک جمود کی کیفیت طاری تھی۔ آہ وہ آنکھیں جو ہمیشہ اسکے لبوں کے ساتھ مسکرایا کرتی تھیں آج بے حس تھیں۔ یہ سرجیت نہ ہو سکتی تھی۔ یہ سرجیت

نہ تھی ۔ یہ تو محض اسکا ایک دھندلا سا عکس تھا ۔

دروازہ کے پہلو میں سرجیت کی ایک قد آدم تصویر رکھی تھی۔ جس کا عکس مقابل کے آئینہ میں اس طرح پڑ رہا تھا کہ نو وارد انسان ایک لمحہ کے لئے یہی تصور کرتا تھا کہ سرجیت قدم بڑھائے اسکی جانب بڑھ رہی ہے ۔

سرندر اٹھا اور سرجیت کی تصویر کے قریب کھڑا ہو کر ٹکٹکی باندھ کر اس کی جانب دیکھنے لگا ۔ اس کا دماغ ایک روحانی اضطراب کے زیر اثر کھول رہا تھا ۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ تصویر میں سرجیت کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی بے بسی پر ہنس رہا ہے ۔ وہ جو کبھی سرندر کے لئے بیقرار رہتی تھی ۔ اب اس کی بے قراری پر مسکرا رہی ہے ۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے مسکراتے ہوئے لب کہہ رہے ہیں ۔ دیکھو سرندر کبھی تم میری والہانہ محبت کا جواب دیتے ہوئے جھجکتے تھے ۔ لیکن آج تم میرے آستانے پر جبیں سائی کے لئے حاضر ہوئے ہو ۔ اور میں تمہارا سجدہ قبول کرنے سے انکار کر رہی ہوں ۔ کبھی میں اپنی آرزوں کو دل ہی دل میں دبا دیتی تھی ۔ یا زبردستی اپنے ارمانوں کی تشنگی بجھانے کے لئے تمہیں اپنے پہلو میں کھینچ لیتی تھی ۔ لیکن آج تمہاری تمام آرزوئیں اس بے دردی سے روندی جا رہی ہیں کہ کوئی پرسان حال نہیں ۔ تم سرندر ــــــ تم جو انتہا درجہ کے لاپرواہ تھے ۔ خود پسند تھے ۔ خود پرست تھے ۔ اور الفت کے نام سے ناآشنا تھے ۔ آج کیا تم وہی سرندر ہو ۔ بولو ۔ بولو ــــــ آج تمہیں یہ کیا ہو رہا ہے ۔ آج کیوں تمہارے دل و جگر خون کے آنسو بہا رہے ہیں ۔ آج کیوں تم گڑگڑا گڑگڑا کر میرے حضور میں ہاتھ پھیلا رہے ہو ۔ جاؤ میں تمہاری دسترس سے باہر ہوں ۔ تم جیتے جی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے جاؤ ــــــ جاؤ ــــــ جاؤ ــــــ

ہا ہا ——— ہا ہا ہا ——— ہا ہا ہا ———

اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ سرجیت کے قہقہے ایک بھٹکا رکی طرح اس کے چہرے پر برس رہے ہیں۔ اس نے تلملا کر منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اور بھاگتا ہوا پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا

رفتہ رفتہ سسکیاں خاموش آہوں میں منتقل ہونے لگیں۔ اور پھر اشکوں کے وہ امڈتے ہوئے چشمے تکیہ میں جذب ہونے لگے۔

وہ ابھی اسی طرح آنسوؤں کی مسلسل روانی میں اپنی آرزوں کو بہائے جا رہا تھا کہ خادم نے دروازہ میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"بابوجی ——— تحصیلدار صاحب پوچھتے ہیں۔ آپ کھانا ڈائیننگ روم میں کھائیں گے یا یہیں بھیج دیا جائے؟"

سرندر نے پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو تکیہ سے پونچھ ڈالے لیکن خادم کی جانب رخ کئے بغیر کہا

"میں کھانا کچھ دیر بعد کھاؤں گا"

خادم چلا گیا اور اپنے ساتھ سرندر کے اشکوں کی روانی بھی لیتا گیا۔ سرندر حیران تھا کہ یک بیک اس کے آنسو تھم کیسے گئے۔ وہ ابلتے ہوئے چشمے جن کے رکنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ ایکا ایکی خشک کیسے ہو گئے وہ تیز و تند طوفان جو اس کے دل و جگر کو بہائے لئے جا رہا تھا دفعتہً ساکت کیسے ہو گیا۔ کیا خادم کی آمد ہی اُسے جذباتی دنیا سے اٹھا کر ٹھوس مادیت کے سامنے لانے کے لئے کافی تھی۔ یا پھر یہ کھانا۔ اور وہ حیران تھا کہ اس جانگسل ماحول میں کھانے کا ذکر ہی کیسے آیا۔ بھلا سرجیت کی یاد کو کھانے سے کیا مناسبت تھی۔ یہ خادم کیوں آیا۔ اور اگر آیا ہی تھا تو

اُسے کھانے کے لئے کہنا ہی کیا ضروری تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ اس گھر کے باشندے اس المناک سانحہ کے بعد بھی کھانے کے متعلق کیسے سوچ سکتے ہیں اور اس نے پھٹی پھٹی نگاہیں اپنے گرد و پیش ڈالیں۔ اُسے کمرہ کے بے رحم سکوت میں اپنی ہستی عجیب بیگانہ سی محسوس ہوئی۔ معاً اس پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس نے خیال کیا کہ اگر وہ سر جیت کے کمرے میں یوں ہی کچھ عرصہ اور تنہا رہا۔ تو یقیناً وہ شدت جذبات سے ہزیان بکنے لگے گا۔ وہ گھبرا کر پلنگ سے اٹھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر اُسے کچھ ڈھارس سی محسوس ہوئی۔ اس نے گہری لمبی سانس لی۔ اور نگاہیں آئینہ سے ہٹالیں۔ قریب ہی ایک تپائی پر دہی یادگار گراموفون رکھا تھا اور اسکے اوپر ریکارڈوں کا ڈبہ۔ معاً اسے اپنا دل سینہ میں زور زور سے دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی انگلیاں کسی مقناطیسی طاقت کے زیر اثر کھنچتی ہوئی ریکارڈوں کے ڈبہ تک پہنچ گئیں۔ اس نے جلدی سے ڈھکنا الٹ دیا لیکن ریکارڈوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کا سر زور سے چکرایا اور اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

ریکارڈوں کے ڈبہ میں سب سے اوپر وہی ریکارڈ ٹوٹا پڑا تھا۔

"چھوٹی بڑی سوئیاں ری"

پانچواں باب

سرمدر کی غیر موجودگی میں ہم نے مکان تبدیل کر لیا۔ ایک دن نوشہرہ سے چھٹی آئی۔ کہ سرمدر سیر کی غرض سے چند یوم کے لئے پشاور چلا گیا ہے۔ اور ابھی میں یہ چھٹی گھر میں سنا ہی رہا تھا کہ کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سرمدر کو آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے کمرہ میں داخل ہوتے پایا۔

"سرمدر تم"۔۔۔۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا "تم کیسے آ گئے"

"جی بس گھر پوچھتے پوچھتے آ گیا" سرمدر نے بیزاری سے ایک جانب سوٹ کیس رکھتے ہوئے کہا۔

"نہ نہ میرا یہ مطلب نہیں" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "نوشہرہ سے یہ خط آیا ہے کہ تم پشاور چلے گئے ہو"

"جی ۔۔۔ اور پشاور سے میں سیدھا یہاں آ رہا ہوں بس" سرمدر نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں نے گھبرا کر دوبارہ اس کے چہرہ کی جانب دیکھا۔ ان

چند ہی دنوں میں اس کا چہرہ اور بھی پژمردہ اور نڈھال ہوگیا تھا اور اس کی آنکھیں اس تیزی سے رنگ بدل رہی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا ایکے سینہ سے پیہم غم کی گھٹائیں اٹھ رہی ہیں۔ جن کے باعث رہ رہ کر اس کی نگاہوں میں تاریکیاں چھا جاتی ہیں اس لئے بات ٹالنے کی غرض سے میں نے کہا۔

"آؤ سرندر تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔"

سرندر کا کمرہ گلی کی جانب تھا۔ جسے عام طور پر گلیوں میں بیٹھک کہتے ہیں دراصل یہ ڈرائنگ روم بھی تھا اور سرندر کا کمرہ بھی۔ اور ان ہر دو ضروریات کا فرنیچر رکھنے کے باعث کچھ عجیب معجون مرکب سا بن گیا تھا۔ سرندر نے بیزاری کے انداز میں کمرہ کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر اسی طرح سوٹ پہنے پلنگ پر دراز ہوگیا میں نے بھی اسے اس وقت کچھ کہنا مناسب خیال نہ کیا اور بلا کچھ کہے دکان پر چلا گیا۔ لیکن دل میں فکر مند تھا کہ دیکھیں سرندر کی پژمردگی کیا رنگ لاتی ہے؟"

دوپہر کو میں کھانا کھانے گھر آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے سرندر کو اس کے کمرہ میں کھڑکی کے قریب مسکراتے دیکھا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ میں مخل ہونا مناسب خیال نہ کیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اسکے قریب پہنچ گیا۔ قریب تھا کہ میں اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھتا۔ کہ میری نگاہ اس کی نگاہوں کی سیدھ میں پڑی۔ سامنے مکان کی کھڑکی میں ایک بھولا سا دلفریب چہرہ مسکرا رہا تھا۔

اس خوش ادا دوشیزہ نے شاید مجھے دیکھ لیا۔ کیونکہ کھڑکی کھٹ سے بند ہوگئی۔ اسی لمحہ سرندر نے پلٹ کر میری جانب رُخ کیا اور مجھے کھڑا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے اسے مزید گھبراہٹ کا موقع نہ دیا۔ اور سرسری انداز

میں کہا ۔

"آؤ سرندر کھانا کھالیں"

"جی میں تو کھا چکا" اس نے اپنے قدیم انداز میں جواب دیا ۔ اور میز سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا ۔

سامنے مکان میں ایک کریانہ فروش رہتے تھے ۔ انکی دو لڑکیاں تھیں ایک تو بیاہی ہوئی تھی اور سسرال میں ۔ دوسری شکنتلا جسے عزت نام میں کنتی کنتی کہہ کر پکارتے تھے ۔ ابھی ناکتخدا تھی ۔ اور گو ایک غریب گھرانے کی پیداوار تھی لیکن نہایت ہی ہوشمند اور سلیقہ شعار تھی ۔ اس پر خدا نے حسن اس غضب کا دیا تھا کہ دیکھنے سے جی نہ بھرتا تھا ۔ لیکن یہاں تو خود صیاد صید بن رہا تھا ۔ سرندر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی ۔ اور نہ معلوم کب تک دیکھتی رہتی اگر اس دیکھا دیکھی میں میں خارج نہ ہوتا ۔

دکان کو واپس لوٹتے ہوئے ایک بار پھر میں نے سرندر کو کھڑکی کے قریب کھڑے مسکراتے پایا ۔ ایک ایسی دلفریب مسکراہٹ جسے اسکے چہرہ پر دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی تھیں اور گو میں اس بات کے حق میں نہ تھا کہ سرندر جگہ جگہ نظریں لڑاتا پھرے ۔ یا شاید اس کی یہ عدیم النظیر مقبولیت میری نگاہوں میں کھٹکتی تھی ۔ تاہم میں مطمئن تھا ۔ کہ اس خوف سے جو سرندر کی بے حسی کے باعث گھر بھر کو پریشان کر رہا تھا ۔ آخر مخلصی حاصل ہوئی ۔ اسلئے میں بھی مسکراتا ہوا دکان کی جانب چل دیا ۔

چند دن گزر گئے اور یہ نظر بازی کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا ۔ لیکن اب اسکے اوقات میں ترمیم ہو گئی تھی ۔ گرمی کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں ۔ اور سرندر نے کالج جانا شروع کر دیا تھا ۔ اسلئے دن کو یہ سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہو گیا

تھا۔ یا شائد انھوں نے خود ہی دن کا وقت دیدار بازی کیلئے موزوں خیال کیا لیکن ادھر شام ہوئی۔ سرندر نے جلدی سے کھانا کھایا۔ اور پڑھنے کا بہانہ کر کے بیٹھک میں پہنچ گیا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ بیٹھک میں قدم رکھے۔ کیونکہ سب جانتے کہ سرندر کی پڑھائی میں مخل ہونا خواہ مخواہ کی آفت مول لینا ہے۔ گو یہ صرف میں ہی جانتا تھا کہ وہ محض مکتب عشق میں نظر بازی کی تعلیم پا رہا ہے۔ ادھر کھڑکی کے قریب تپائی پر ٹیبل لیمپ رکھ کر سرندر کتاب سامنے رکھے نظریں کنتی کے چہرہ پر جما دیتا۔ ادھر شکنتلا ہر کمین کو کھڑکی میں رکھے چادر۔ میز پوش یا رومال کاڑھتے ہوئے سر کو ذرہ کر بلند کرتی۔ اور سرندر کی نگاہوں سے نگاہیں ملا دیتی اور پھر مسکرا کر سر جھکا لیتی۔ اور یہ سلسلہ رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک جاری رہتا حتیٰ کہ کنتی کی ماں چھت پر سے بار بار آوازیں دے کر اُسے آجانے کے لئے مجبور کر دیتی۔ اور سرندر بجلی کے پنکھے کا رُخ پلنگ کی جانب کر کے وہیں بیٹھک میں سو جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شکنتلا کے ایک منزلہ مکان کے پہلو میں ایک دو منزلہ مکان میں سرندر کے ایک رشتہ سے اگر اُسے رشتہ کہا جانا ضروری ہے تو سرندر کی بوا رہا کرتی تھی بوا اسلئے کہ وہ سرندر کے والد کی حیات میں انہیں بھائیصاحب کہا کرتی تھی خیر تو یہ بوا خواہ کوئی بھی تھی۔ اس کی ایک جوان سال لڑکی تھی ــــ شانتی اچھی شکل صورت۔ لیکن ایسی بھی نہیں کہ انسان دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ یہ شانتی شکنتلا کی سہیلی تھی اور دن میں اکثر دونوں سہیلیاں اکٹھی بیٹھ کر کشیدہ وغیرہ کاڑھتی تھیں اور اب تو گزشتہ کئی دنوں سے شکنتلا نے ہر روز شانتی کے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔

شانتی کو چونکہ ہمارے گھر میں کافی دسترس تھی اور ہمارا بھی انکے ہاں

آنا جانا عام تھا۔ اسلئے شکنتلا کا یہ تصور کرنا کہ اس ذریعہ سے وہ بہت جلد اپنے محبوب تک پہنچ جائے گی۔ کچھ بیجا نہ تھا۔ کیونکہ بہت جلد اُنہیں ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کے مواقع میسر آنے لگے۔

کچھ دنوں سے سرندر نے ایک جمناسٹک کلب میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اور اس کے فطری رجحان نے اُسے بہت جلد ان کھیلوں میں ماہر کر دیا تھا کلب کا ایک پبلک شو ہوا۔ اور اس شو میں سرندر نے جھولے پر کام کیا۔ جس پر اُسے میڈل بھی ملے۔ اور لوگوں نے خوب خوب تالیاں بھی پیٹیں۔

اس سے دوسرے دن کا ذکر ہے۔ سرندر کسی کام سے شانتی کے گھر گیا۔ چبارے میں اس نے شانتی اور شکنتلا کو ایک چادر پر پھول کاڑھتے دیکھا۔ وہ اپنا کام تو بھول گیا اور مسکراتا ہوا شانتی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"کرسی پر بیٹھئے نا" شانتی نے سرندر کو سوٹ کے ساتھ دری پر بیٹھتے دیکھ کر کہا "یوں دری پر بیٹھے ہوئے آپ اچھے نظر نہیں آتے"

"نہیں ہم تو تمہارے پاس ہی بیٹھیں گے" سرندر نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ پتلون آپ کو بیٹھنے دے گی"

"پوچھ لیتا ہوں پتلون سے" سرندر نے اسی انداز میں جواب دیا "کیوں ری پتلون مجھے بیٹھنے دے گی یا نہیں" اور ایک لمحہ توقف کے بعد

"جی بتا آپ نے کیا کہتی ہے پتلون"

"نہیں تو"

"جی پتلون کہتی ہے۔ مجھے تو آپ کے یہاں بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ سرمتی شانتی دیوی بھی آپ کو یہاں بیٹھنے دیں۔

اس پر شکنتلا نیچی نظریں کئے ہوئے خوب مسکرائی اور شانتی نے کھسیانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو منع کرتی ہوں۔ یہ اور لو"۔

"آگے ہی آپ نے جو دیا ہے وہی کیا کم ہے۔ اب اور کیا لوں"۔

"آپ نے مجھ سے کب کچھ مانگا ہے۔ جو میں نے انکار کیا ہے"۔

"تو اب مانگ لوں"۔

"بڑی خوشی سے"۔

"تو یہ چادر کاڑھ کر مجھے دیدینا"۔

شانتی ایک لمحہ کے لئے کچھ ہچکچائی۔ تو شکنتلا نے چادر کے پس پردہ شانتی کے پاؤں کو اپنے پاؤں کی انگلیوں سے زور سے دبا دیا۔ اس نے مستفسرانہ نگاہیں شکنتلا پر ڈالیں۔ شکنتلا نے پلکوں کی جنبش سے کچھ اشارہ کیا۔ اور شانتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ چادر آپ کی ہوگئی"۔

"آج تو کچھ اور بھی مانگ لیتا تو بھی مل جاتا" کہتے کہتے سریندر نے ایک بیباک نگاہ شکنتلا پر ڈالی۔ شکنتلا نے جھینپ کر نگاہیں اور بھی نیچی کرلیں۔ اور شانتی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور کیا مانگوگے"۔

"آج تو اور کچھ نہیں مانگوں گا" سریندر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ تم سمجھو گی لالچی ہے"۔

"کہاں چلے اب بیٹھو نا"۔

"ذرا کلب تک جانا ہے"۔

"اچھا تشریف لے جائیے"۔

"تقدیر ہی ایسی ہے"

"چمگادڑ ہو گیا"

"نہیں اُلّو"

"وہ کیوں"

"تمہیں جو منہ لگا رکھا ہے"

اور شانتی کی سب شوخی ایک لمحہ میں غائب ہو گئی۔ اسے اپنے لب خشک ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور اس نے جھینپ کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ سرندر چلتے چلتے رُک گیا۔ اپنے الفاظ کی تیزی اُسے خود بُری محسوس ہوئی اس نے کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیجئے اب بیٹھا ہوں"

"زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے ہونا" شانتی نے بیزاری سے کہا۔ لیکن جب سرندر کو اس کا کوئی جواب نہ ملا اور شکنتلا کی مسکراہٹ چہرہ پر پھیلتی ہی گئی۔ تو شانتی کو اپنی خفت کے سب آثار مٹتے ہوئے نظر آئے اور ایک بار پھر ایک شوخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھل اٹھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اب تمہارے کلب کا کھیل کب ہو گا"

"کیوں کل کھیل پسند آیا؟"

"جی"

"کونسا"

"سب ہی تو اچھے تھے"

"شانتی ۔۔۔" شکنتلا نے جھجکتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتاؤں مجھے کونسا

کھیل پسند آیا۔"

"بتاؤ۔"

"مجھے تو سب سے زیادہ جھولے کا کھیل پسند آیا۔"

"اچھا"۔۔۔ اور شانتی نے ایک تیز نگاہ شکنتلا کے چہرہ پر ڈالی اور پھر سرندر کے۔ اس نے دیکھا کہ جو مسکراہٹ شکنتلا کے لبوں پر کھلنا شروع ہوئی تھی۔ وہ سرندر کے چہرہ پر پھیلتی جا رہی ہے۔ شاید نگاہوں کی برقی طاقت نے اُسے ایک چہرہ سے دوسرے چہرہ پر منتقل کر دیا تھا۔ وہ خوب جانتی تھی۔ کہ شکنتلا کی زیر لب مسکراہٹ سرندر کی کھلتی ہوئی ہنسی سے کیا کہنا چاہتی ہے اس نے قدرے تلخ انداز میں کہا۔

"اس اُلو کی تعریف کر رہی ہو۔ جھولے کا کھیل تو اس نے کیا تھا۔"

"اچھا!۔۔۔" اور شکنتلا نے کچھ ایسے محبوب انداز سے سرندر کی جانب دیکھا کہ شانتی اور بھی سٹ پٹا گئی۔ اور اپنی سہیلی کی دیدہ دلیری کو دل ہی دل میں کوسنے لگی۔ دیکھو تو کیسی بھولی بنتی ہے جیسے اسے معلوم ہی نہ تھا کہ جھولے پر سرندر نے کام کیا ہے۔ اونہہ۔ اور اس نے چادر کاڑھنے میں تیزی سے ہاتھ چلایا۔ تو سوئی اس کے بائیں ہاتھ میں چبھ گئی۔ سی سی ی ی ی وہ درد سے چلائی اور چادر ایک جانب پھینک دی۔

سرندر شکنتلا کے الفاظ سے ایک عجیب طرح کی لذت محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہ گدگدی دل سے سرسراتی ہوئی حلق تک آ کر اٹک گئی تھی۔ شانتی کی سی ی ی ی نے یہ بند بھی توڑ دیا۔ اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"دیکھا مجھے اُلو کہنے کا نتیجہ۔" سرندر نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا

اب اگر خیر چاہتی ہو تو جلدی سے معافی مانگ لو۔"

"اب معاف کرو نا بابا" شانتی نے تلخی سے کہا۔

"معافی مانگ رہی ہو" سرندر نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا معاف کیا نستے۔" پھر شکنتلا کی جانب رُخ کرتے ہوئے کہا۔ "نستے جی" اور دیکھتے دیکھتے سرندر کھٹ کھٹ سیڑھیوں سے اتر گیا۔

۳

اس سے دوسری شام کا ذکر ہے۔ تاریکی آہستہ آہستہ انسانوں کو خوابوں کی دنیا کی جانب لے جا رہی تھی۔ سرندر ابھی ٹیبل لیمپ کو کھڑکی کے قریب لیجا کر تصورات کی دنیا آباد کرنے ہی والا تھا کہ کمرہ کا دروازہ کھلا اور شانتی نے قدم اندر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں سب معلوم ہو گیا ہے سرندر جی۔"

"کیا؟" سرندر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہم نہیں بتائیں گے جی۔" شانتی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"یہ خوب رہی۔"

"جی ہاں" شانتی نے دائیں ہاتھ کی انگلی کو آنکھوں کے قریب لیجا کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بڑے بھولے ہیں آپ۔"

"ارے بھئی کچھ کہو بھی تو سہی۔ یا یونہی فتوے لگانے شروع کر دیئے۔"

"اب آپ کا ہے کو سمجھیں گے۔" شانتی نے ایک خاص انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ کہو بھی تو۔" سرندر نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

"کہہ دوں پھر؟"

"ہاں ہاں"

"اور جو منہ اتنا سا رہ گیا تو"

"اب منہ تو کتنی ٹیڑھتی بھولے سے رہا۔ تم بات کرو۔"

"شکنتلا کی بات ہے۔"

"تو پھر کہہ بھی دو۔"

"اتنے بیقرار کیوں ہوتے ہو۔"

"کہو بھی۔"

"شکنتلا کہتی ہے۔ کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ اسے حساب کے سوال نکلوا دیا کریں۔"

"بس"

"جی بس"

"واہ خوب۔ اس بات کی اتنی تمہید باندھی جا رہی ہے۔ ارے تو تو بالکل پگلی ہے شانتی" اور یہ کہتے کہتے سرندر نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"جی ہاں۔ میں پگلی ہوں۔" شانتی نے طنز سے کہا۔ "لیکن اتنی بھولی نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"وہ کیونکر"

"شکنتلا نے مجھے آپ سے حساب کے سوال نکلوانے کیلئے کیوں کہا۔"

"یہ میں کیا جانوں"

"جی ہاں۔ آپ کیا جانیں۔ آپ تو بالکل بھولے ہیں۔"

"تو کیا اس میں بھی کوئی بھید ہے۔"

"جی میرا بھی تو بڑا بھائی ایف۔ اے میں پڑھتا ہے۔ اس سے کیوں نہیں سیکھ لیتی حساب وہ" کہتے ایک طنزیہ مسکراہٹ شانتی کے چہرہ پر کھل اٹھی۔

"اب یہ میں کیا جانوں" —— سرندر نے بیزاری سے کہا۔۔۔۔

"اوہو۔ آپ تو بالکل ننھے ہیں" شانتی نے پچکارتے ہوئے کہا۔۔۔

۔۔۔" جاکر نکلوائیے نا بیچاری کو سوال۔ بیچاری کو حساب آتا جو نہیں۔ صرف بیچاری آٹھویں میں اول رہی ہے۔ ہی ہی ہی۔ ہی ہی ہی۔" اور سانتی پر ہنسی کا ایک دورہ پڑا۔

"تو پھر اس میں میرا دماغ کیوں چاٹ رہی ہو۔ میں تو اُسے کہنے نہیں گیا کہ مجھ سے حساب کے سوال سیکھے۔" سرندر نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "جاؤ مجھے پڑھنا ہے"۔

"جی" شانتی نے سرندر کی برہمی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ "لائیے آپ کا لیمپ تپائی پر رکھ دوں۔ اور پھر سرندر کے تیوروں کی جانب دیکھے بغیر اس نے ٹیبل لیمپ اٹھا کر کھڑکی کے قریب پڑی ہوئی تپائی پر رکھ دیا سامنے اپنے مکان کی کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی شکنتلا بیقرار نظروں سے سرندر کی کھڑکی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

شانتی تیزی سے سرندر کو بازو سے پکڑ کر کھڑکی کے قریب کھینچ لائی اور پھر سکنتلا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"وہ دیکھئے کتاب کھلی رکھی ہے۔ اب پڑھنا شروع کر دیجئے"۔ اور خود کھڑکی سے ایک جانب ہٹ کر مست قہقہے لگانے لگی۔۔

"شانتی۔ یہ بات اچھی نہیں" سرندر نے غصہ سے کھڑکی کو بند کرتے ہوئے کہا

"جی ہاں - یہ بات اچھی نہیں"۔ شانتی نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی دیکھ لے تو مفت میں بدنامی ہو جائے"

"شانتی ––– تم نہیں مانو گی"۔ سرندر نے شانتی کی کلائی پکڑ کر تیز نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے دیکھا۔

"جی ––– میرے ماننے کا کیا ہے"۔ شانتی نے کلائی چھڑانے کی ضرورت محسوس کئے بغیر کہا۔ "بات تو شکنتلا کے ماننے کی ہے"۔ کہتے کہتے اس نے شوخ نگاہیں سرندر کی نگاہوں سے ملا دیں۔ اور سرندر ان نگاہوں کا مدعا سمجھتے ہی کانپ اٹھا! اسکی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر دفعتاً ایک خیال برق کی سی تیز رفتاری کے ساتھ اسکے دماغ میں کوندا۔ اس نے بڑھ کر شانتی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلنگ کے قریب پہنچ گیا۔ اُسے پلنگ پر لٹا یا اور جھک کر اپنے لب اسکے لبوں سے پیوست کر دیئے۔ شانتی نے مست نشیلی آنکھوں سے سرندر کی جانب دیکھا اور پھر جھپکے سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسکے ملائم گداز بازو آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے سرندر کے بازوؤں کے گرد حائل ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی سرندر کے لبوں کی سختی اس کے لبوں پر۔ پھر جس طرح یک لخت کوئی سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ سرندر نے ایک جھٹکے ساتھ خود کو شانتی کے بازوؤں سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

"جی اب جائیے"

"سرندر"

"بس اب جائیے نا"

"سرندر"

"جی دروازہ وہ رہا" سرندر نے سکندلا کے سامنے والی کھڑکی کھولتے ہوئے

بے نیازی سے دروازہ کی جانب اشارہ کیا اور پھر نگاہیں شکنتلا کی نگاہوں سے ملادیں۔ دوسرے لمحہ شانتی سر جھکائے چپکے سے کمرہ سے باہر ہوگئی۔

۳

شکنتلا اور شانتی کی ان بن ہوگئی۔ اور سوائے سرندر کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیوں۔ شکنتلا کی جرأت قابل تعریف تھی کہ اس نے بہت جلد ہمارے گھر سے راہ و رسم پیدا کرلی۔ پہلی دفعہ وہ میری رفیقۂ حیات سے چادر کاڑھنے کے لئے کوئی نمونہ لینے آئی۔ گو یہ محض ایک بہانہ تھا۔ کیونکہ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے کہ میری رفیقۂ حیات کو کشیدہ کاری میں اس جیسی مہارت حاصل کرنے کیلئے برسوں اسکی شاگردی کی ضرورت تھی۔ میری رفیقۂ حیات بھی خوش تھی کیونکہ شکنتلا سی ہوشیار لڑکی بات بات میں اس سے دبتی تھی اور اس کے ہر کام کو خندہ پیشانی سے سرانجام دینے میں اپنی سعادت خیال کرتی تھی۔

ایک دن میں شام کو گھر آیا تو میں نے سرندر کے بستر پر ایک نئی چادر دیکھی جس کے پلو پر نیلے رنگ سے نہایت خوبصورت پھول کاڑھے گئے تھے گھر میں چونکہ ایسی چادر موجود نہ تھی اس لئے میں نے یوں ہی اپنی حیرت رفع کرنے کے لئے استفسار کیا۔

"یہ چادر کہاں سے لی؟"

"لے لی"

"بتاؤ گے نہیں"

"بتادیں گے"

"کب"

"رات کھانا کھانے کے بعد"

"ابھی نہیں"

"اوں ہونہہ" —— اور سرندر نے کچھ ایسی مخمور نظروں سے میری جانب دیکھا کہ مجھے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ لیکن اسکے اس وعدہ نے میرا اشتیاق اور بھی تیز کر دیا۔ اس شام میں کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکا۔ میرے دل میں ایک کھلبلی سی مچ رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس راز سے آگاہ ہو جاؤں۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے سرندر کی جانب دیکھا۔ اس نے میز سے اٹھ کر مزے مزے سے ہاتھ دھوئے۔ کلیاں کیں اور پھر تولیہ سے ہاتھ پونچھ کر کہنے لگا

"آؤ چلیں"

"کہاں"

"میرے کمرہ تک"

"چلو" اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ کمرہ میں پہنچ کر اس نے لیمپ کھڑکی کے سامنے تپائی پر رکھا اور پھر کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر مجھے پہلو سے جھانکنے کے لئے کہا۔ میں نے دیکھا۔ اپنے مکان کی کھڑکی کے قریب بیٹھی شکنتلا عجیب اشتیاق سے سرندر کی کھڑکی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ اسکے زانوں پر ایک نیلے رنگ کا ریشمی رومال ہے جس کے ایک کنارے پر وہ سرخ دھاگے سے گلاب کی پتیاں بنا رہی ہے یا شاید بنا چکی ہے۔ سرندر نے مجھے پیچھے ہٹ جانے کے لئے کہا۔ اور پھر شکنتلا کو مخاطب کرنے کیلئے اس نے ایک ہلکی سیٹی بجائی۔ شکنتلا اسکی جانب متوجہ ہوئی تو سرندر نے بلا کسی تمہید کے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"یہ رومال تو ہم لیں گے"

"آپ ہی کے لئے تو ہے" اسی طرح ہلکی سرگوشی کے انداز میں ایک سہمی ہوئی

آواز سنائی دی ۔

"تو پھینک دو۔"

"پکڑ لیں گے آپ"

"جی!"

اور شکنتلا نے رومال کو ایک گیند سی بنا کر سرندر کی جانب اچھال دیا جسے سرندر نے ایک باکمال مداری کی طرح ہاتھ بڑھا کر دبوچ لیا اور پھر کھڑکی سے ہٹ کر رومال مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگا ۔

"یہ چادر بھی یہیں سے آئی ہے۔"

"اچھا!"

"جی!"

اور اس نے رومال رکھنے کے لئے اپنے چمڑے کا سوٹ کیس کھولا۔ میں نے دیکھا اس میں عجیب عجیب رنگوں کے قریب قریب ایک درجن رومال رکھے تھے ۔ اس نے شرارت آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر جلدی سے سوٹ کیس بند کر دیا۔ دوسرے لمحہ اس نے کھڑکی کے قریب جاتے ہوئے کہا ۔

"آپ اگر جانا چاہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور میں وہاں ٹھیرنے کا کوئی بہانہ نہ دیکھتے ہوئے چپکے سے چلا آیا ۔

۴

کہاں تو یہ عالم تھا کہ ساوتری کے والدین ساوتری کی سگائی سرندر سے کرنے کیلئے بیتاب ہو رہے تھے ۔ اور کہاں اب سرندر کے والد کی وفات کے بعد انھوں نے چپکے چپکے ساوتری کی سگائی شانتی کے بڑے بھائی اوم پرکاش سے کرنے کی بات چیت

شروع کر دی اور نسبت کے روز تو بات چیت قریب قریب پختہ ہو گئی۔ گھر میں یہ خبر سانحہ سے کم حیثیت نہ رکھتی تھی۔ میری رفیقۂ حیات کا چہرہ سنتے ہی غصہ سے لال انگارہ ہو گیا۔ وہ اسی وقت غصہ سے بھری ہوئی اپنے ماموں کے گھر گئی اور رہتو اتر کئی گھنٹے ان سے لڑتی جھگڑتی رہی۔ گھر میں ہر کوئی اداس تھا۔ ماسوا سرندر کے جس نے سن کر ایک بیباک قہقہہ لگایا اور کھکھلاتا ہوا اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

شام کو جب میری رفیقۂ حیات واپس آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ایک اس طرح کی پریشانی اس کے اعضا سے مترشح تھی کہ جس سے میں تاحال ناآشنا تھا۔ اس نے چاچی جی (سرندر کی والدہ) سے صرف اتنا کہا "وہ نہیں مانتے" اور پھر سرندر کے کمرہ کی جانب چل دی۔ میں بھی سب حال جاننے کیلئے ساتھ ہو لیا۔ سرندر کمرہ ہی میں موجود تھا۔ اس نے بھابی کا اترا ہوا چہرہ دیکھتے ہی کہا۔

"کیوں خیر تو ہے بھابی"

"ہاں خیر ہے" میری رفیقۂ حیات نے پژمردگی سے جواب دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ارے خیر ہے تو پھر تم نے منہ کیوں اتنا سا بنا رکھا ہے" سرندر نے اپنے مخصوص انداز میں بھابی کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہنس رہے ہو۔ اور ادھر ساوتری کا رو نے روتے برا حال ہو رہا ہے"

"ارے وہ کیوں" سرندر نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا

"تم کیا جانو۔ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے"

"کیا بیت رہی ہے"

"وہ کہتی ہو کہ میری سرندر سے سگائی نہ ہوئی تو میں زہر کھا لوں گی"

"بھابی"

"کیوں"

"یہ سب سچ ہے؟"

"ہاں"

"تو پھر وہ اپنی والدہ سے کیوں نہیں کہتی"

"اس نے کہا"

"پھر"

والدہ نے اُسے گالیاں دیں۔ نرلج، بے شرم اور نہ معلوم کیا کیا کہا، اور جب اس نے ضد کی تو اسے پنکھے کی ڈنڈی سے دو ایک جڑ بھی دیں۔ تب سے بچاری برساتی میں پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔

"اور اس کے والد؟"

"وہ اس کی سنیں گے یا اس کی والدہ کی؟"

"ہوں"

"میں گئی تو بچاری برساتی میں ایک کھاٹ پر بستروں کے ڈھیر میں پڑی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ "میں زہر کھا لوں گی بہن" میں نے کہا "پگلی ہوئی ہے سا وتری" تو کہنے لگی "ماں باپ کو میری زندگی کی ضرورت نہیں تو پھر میں جی کر کیا کروں گی"۔ پھر اپنا سر میری گود میں رکھ کر حسرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے۔ اس نے ایک دردناک لے میں کہا ؎

چن چڑھے ہوئے لہہ گئے نی

اساں غریباں دے کم بنے ہوئے رہ گئے نی

ایسی کہ میں خود بھی رونے لگی" پھر . . . ."

"بھابی!!!"

"ہوں"

"اب خاموش ہو جاؤ۔ کیوں مجھے رُلانے پر کمر باندھ رہی ہو"

"اب خاموشی سے کچھ نہ بنے گا سرندر"

"اور اب ہو بھی کیا سکتا ہے"

"تم مرد ہو۔ ذرا ہمت سے کام لو سب ٹھیک ہو جائے گا"

"وہ کیسے"

"ساوتری کو لے کر بھاگ جاؤ"

"بھابی!" سرندر نے حیرت زدہ ہوتے کہا۔

"میرے سب زیورات لے جاؤ" میری رفیقۂ حیات نے سرندر کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا" اور کہیں دور چلے جاؤ۔ ایک سال اِدھر اُدھر کاٹ آؤ۔ پھر خود ہی بات دب جائے گی"

"بھابی!"

"کیا"

"ساوتری جائے گی؟"

"وہ تیار ہے"

ہوں۔ اور سرندر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی سینما ہال میں بیٹھا ہے۔ اور ایک سٹنٹ فلم تیزی سے چل رہا ہے۔ وہ ساوتری کا بازو تھامے کسی نامعلوم مقام کی جانب بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ساوتری کے قریب سے اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جاتی ہے اور ساوتری ہے کہ رہ رہ کر اس کے بازو سے لپٹی چلی جا رہی ہے۔ دھک دھک دھک دھک اسکے دل کی دھڑکن بڑھتی چلی جا رہی ہے جیسے برقی چھاپہ خانہ

میں لیتھوکی مشین ابھی پوری رفتار سے چل رہی ہو۔ بھاگتے بھاگتے ساوتری ہانپنے لگتی ہے ۔ وہ رک کر ساوتری کو اپنے سینے سے لپٹا لیتا ہے اور پیار بھری نظروں سے اس کے چہرہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہتا ہے ۔

"ساوتری !"

"سوامی"

اور اُسے ساوتری کے سوامی کہنے سے عجیب طرح کی برتری کا احساس ہوتا ہے اُسے اپنے سینے میں ایک بعید از فہم لذت محسوس ہوتی ہے اور اُسے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پھیلتا جا رہا ہے ۔ کائنات کے ذرہ ذرہ پر چھاتا جا رہا ۔ وہ ایک حسین دوشیزہ کا سوامی ہے ۔ وہ کائنات کی حسین ترین شئے کا مالک ہے ۔ وہ تمام کائنات کا مالک ہے اور اس برتری اور ملکیت کے احساس سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھتا ہے ۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"بھابی میں تیار ہوں"

"سمندر تم کتنے اچھے ہو" اور میری رفیقہ حیات نے بڑھ کر سمندر کا منہ چوم لیا ۔

۵

بھابی کے چلے جانے کے بعد یکایک سمندر کو یوں محسوس ہوا ۔ جیسے اسے ایک خلا میں پھینک دیا گیا ہے ۔ اُسے اپنا دماغ ایک ذبح کئے ہوئے پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا محسوس ہوا ۔ وہ حیران تھا کہ اس نے بھابی سے بھاگ جانے کا وعدہ کیسے کر لیا ۔ بھابی خیر وہ تو شروع ہی سے جلد باز چلی آئی ہے لیکن خود اُسے کیا ہو گیا تھا ۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا ۔ کہ ماتا جی کیا کہیں گی اور دنیا ؟ . . . . اور ایکا ایکی اُسے اپنے دل کی دھڑکن پھر تیز ہوتی محسوس ہوئی ۔ پھر اسکے سینہ میں ایک چھاپہ خانہ

چلنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک کھل گئیں۔ یکایک اُسے تمام کائنات گھومتی نظر آئی۔ کئی چھاپہ خانے برق کی سی تیز رفتاری کے ساتھ چلتے نظر آئے۔ پھر دھند چھانے لگی ایکا ایکی اس دھند میں سے اُسے چند اخبار فروش لڑکوں کی صورتیں نمودار ہوتی نظر آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں اخباروں کے بڑے بڑے پلندے تھے۔ اور وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

آج کا تازہ اخبار

گرما گرم خبریں

"ڈی۔ اے۔ وی کالج راولپنڈی کا ایک طالب علم ایک جوان لڑکی کو بھگا کر لے گیا۔ سالیقہ عشق کا شاخسانہ"

"ایک معزز ہندو گھرانے کی لڑکی اغوا کرلی گئی"

"سگائی چھوٹ جانے پر ایک نوجوان کی برہمی"

"اپنی منگیتر کو دوسرے کے پہلو میں جاتا دیکھ کر برداشت نہ کرسکا"

پڑھو جی ——————————

پرتاپ، ملاپ، زمیندار، ریاست، احسان، پربھات، ویر بھارت اخبار . . . ."

اسے اخبار فروش لڑکوں کی صدائیں اپنے کانوں میں چیختی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اور چپکے سے پلنگ پر لیٹ گیا۔

بجلی زور سے کڑکی اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ قدرت اسی طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی جس طرح سرندر۔ لیکن حیرت تھی کہ اس دماغی برہمی کے باوجود بہت جلد نیند نے اُسے اپنی گود میں تھپکیاں دے کر سلا دیا۔

دوسرے دن صبح جب وہ بیدار ہوا۔ تو مطلع صاف تھا۔ اور اس کا دماغ بھی اس نے چاہا کہ وہ گزشتہ واقعات پر غور کر کے اپنے لیے کوئی صحیح راستہ تلاش کرے کہ معاً کمرہ کا دروازہ کھلا اور شانتی نے وہیں دروازہ میں کھڑے کھڑے کہا۔ "سرندر جی مبارک ہو۔ میرے بھیا کی سگائی ہوئی ہے۔" اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہ سرندر کا منہ چڑا کر اپنے گھر بھاگ گئی۔

سرندر کے لئے اب فیصلہ کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس کے لئے بھابی سے کئے ہوئے وعدے کو نبھانے کے سوا چارہ نہیں پھر ہرچہ بادا باد۔ کم از کم اُسے ایک حسین لڑکی کا قرب تو حاصل ہوگا۔

چند دن گزر گئے لیکن اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ تجویز یہ قرار پائی تھی کہ ساوتری کو میری رفیقۂ حیات کی ماؤسی جسے اس راز میں شریک کیا گیا تھا کسی بہانے اپنے گھر لے آئے جہاں سرندر اس کا منتظر ہو۔ پھر دونوں پہلی گاڑی سے بمبئی بھاگ جائیں۔"

لیکن یا تو ساوتری کے والدین کے کانوں میں اس بات کی بھنک پڑ گئی یا انھوں نے خود ہی ساوتری کی آمد و رفت پر پابندیاں عائد کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری رفیقۂ حیات کی ماؤسی کی سب کوششیں بیکار گئیں اور وہ ساوتری کو اپنے گھر لانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بات اپنی دلچسپی کھوتی گئی۔ میری رفیقۂ حیات کا جوش بھی کم ہوتا گیا اور سرندر کو تو اس روز روز کی دوڑ دھوپ سے بیزاری سی ہونے لگی۔ ادھر تقدیر نے ایک کروٹ لی۔ سرندر ایک روز کسی دعوت پر گیا۔ وہاں باہر سے ایک بہت بڑے زمیندار بھی آئے ہوئے تھے۔ سرندر انہیں ایسا بھایا کہ انہوں نے اسی روز اپنی دوہتی کی سگائی سرندر کی والدہ کو ڈال دی۔ سرندر کی والدہ ہماری سکیموں سے محض ناآشنا تھی اور چاہتی تھی کہ سرندر کی سگائی جلد از جلد

ہو جائے تاکہ ساوتری کے والدین کا غرور ٹوٹے ۔ سگائی دھوم دھام سے ہوئی اور سرندر کی والدہ نے خوب خوب دل کے ارمان نکالے ۔

اور اس سے کچھ ہی عرصہ بعد ساوتری کی شادی شانتی کے بڑے بھائی سے ہوگئی ۔ اور ایک دن بسنت کے میلہ پر اتفاقاً ساوتری سرندر کو تنہا جاتی ہوئی نظر پڑ گئی ۔ وہ راستہ کاٹ کر اس جانب ہو لیا لیکن اس سرندر کے پیچھے زہر کھا لینے والی ساوتری نے سرندر کو نمستے تک نہ کی اور منہ دوسری جانب کر کے پہلو سے گزر گئی ۔

اور وہ منہ چڑانے والی شانتی سرندر کی بے نیازی اور لاپرواہی کے کچوکے کھاتی رہی اور گو اس کے سینے پر سانپ لوٹتے رہے ۔ اسکے چہرہ کی طنزیہ مسکراہٹ بدستور رہی حتیٰ کہ اس درد و کرب سے پھنکتی ہوئی وہ تپ دق کا شکار ہوگئی ۔

اور ایک طول طویل برس کی لمبی لمبی گھڑیوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتی ہوئی نابود ہوگئی لیکن سرندر اپنی بے وفائی کا دردناک انجام دیکھنے سے محفوظ تھا ۔ وہ تو کب کا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور جا چکا تھا ۔

چھٹا باب

نوٹ :۔ اس سے پیشتر میں سرندر کے پہلو بہ پہلو رہا۔ یا اگر وہ مجھ سے جدا بھی ہوا تو چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں کے لئے۔ اسلئے گزشتہ سب واقعات مجھے ساتھ ساتھ معلوم ہوتے رہے۔ اب جب کہ سرندر لاہور میں تھا۔ اور گاہ گاہ ایک آدھ دن کے واسطے مجھ سے ملنے کے لئے آجاتا تھا۔ ذیل کے واقعات مجھے قسطوں میں معلوم ہوئے۔ لیکن تسلسل قائم رکھنے کے لیے میں انہیں سلسلہ وار بیان کرتا ہوں۔

لاہور میں آکر سرندر کی ایک پرانی عادت پھر سے عود کر آئی یعنی چاکلیٹ کھانا یا شاید قدرت ایک پیکر لطافت کو سرندر کے چاکلیٹوں کا نشانہ بنانا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے سرندر میں اس بھولی بھٹکی عادت کو پھر سے بیدار کرنا مناسب سمجھا۔ اور یہ عادت

بیدار بھی ہوئی تو اس شدت سے کہ اس نے ڈبوں پر ڈبے خریدنے شروع کئے شاید اسکی نگاہ ایک آدھ ڈبے سے نہ بھرتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ کم از کم طرح طرح کے چاکلیٹوں کے پانچ سات ڈبے ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہیں۔

لاہور میں بجائے اس کے کہ وہ کسی ہوٹل میں قیام کرتا۔ اس نے گوالمنڈی میں ایک چوبارہ کرایہ پر لیا۔ اور اُسے اپنی پسند سے آراستہ کیا۔ اسکے پہلو میں ایک چوبارہ میں کوئی مسٹر کولا رہتے تھے جو شاید ہائی کورٹ میں سٹینو تھے۔ تیس پینتیس سال کے ایک زندہ دل انسان۔ سوسائٹی کے ایسے رکن جنھیں رندانہ اصطلاح میں بال برہمچاری کہتے ہیں۔ پہلے ہی دن انھوں نے سرندر کو چاء پر مدعو کیا اور بہت جلد کھل گئے سرندر میں انھوں نے نہ معلوم کیا وصف دیکھا کہ اسے جھٹ سے پرنس کا لقب دیدیا اور سرندر بھی اس لقب پر جھوم اٹھا۔ بہت جلد ان کے تعلقات گاڑھے ہوگئے پھر تو یہ حالت ہوگئی کہ بلا نوٹس ایک دوسرے کے پاس جانے لگے۔ مسٹر کولا ایک زبردست شاطر تھے۔ سرندر کو بھی ان سے شطرنج سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور وہ اپنی فرصت کے بیشتر اوقات ان کی صحبت میں بسر کرنے لگا۔ مسٹر کولا کو بھی سرندر کی صحبت مرغوب تھی کیونکہ سرندر نے گزشتہ چند ماہ سے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اور گو مسٹر کولا ادیب نہ تھے لیکن ادب کے پرستار ضرور تھے۔ سرندر میں انھوں نے ایک حد اس روح پائی اور اس بات کا اعتراف انھوں نے خود ایک بار سرندر سے بھی کیا۔ چاندنی رات تھی۔ سرندر اور مسٹر کولا چھت پر بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے اتفاقاً کولا کا وزیر سرندر کے گھوڑے سے پٹ گیا۔ کولا کو شک گزرا کہ گھوڑا پہلے سے اس خانہ میں نہ تھا۔ سرندر نے ضرور کچھ چالاکی کی ہے اس بات کا اظہار انہوں نے نہایت بیباکی سے کر دیا۔ سرندر کو یہ امر اسقدر ناگوار گزرا کہ اس نے اسی وقت کھیلنا چھوڑ دیا اور اٹھتے ہوئے کہنے لگا " اب آپ سے شطرنج نہیں کھیلوں گا۔

کولا غریب خوب حیران ہوا۔ اس نے یہ بات یوں ہی سرسری انداز میں کہدی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ سرندر اسے اس رنگ میں لیگا اور اس دوستانہ بےتکلفی کو اپنی توہین خیال کرے گا۔ اس نے بڑھ کر سرندر کے ہاتھ پکڑ لیے لیکن کتنی ہی دیر وہ اُسے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور آخر کہا بھی تو صرف اتنا۔

"پرنس۔ میں نے تم سا حساس آدمی آج تک نہیں دیکھا"

دوسرے دن مسٹر کولا خود سرندر کو منانے گئے۔ سرندر نے بھی بات کو طول دینا مناسب خیال نہ کیا۔ اور ان سے کہہ دیا کہ آپ چلیے میں دو منٹ میں کپڑے تبدیل کر کے پہنچا۔

سرندر جب مسٹر کولا کے کمرہ میں پہنچا تو بجائے اس کے کہ وہ مسٹر کولا کو اپنا منتظر پاتا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گلی کی جانب کھلنے والی ایک کھڑکی سے چپک رہے ہیں

"کیوں خیر تو ہے؟" سرندر نے اپنے مخصوص انداز میں اِستفسار کیا۔

"سس ——— مسٹر کولا نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنے قریب بلا لیا

سرندر کے قریب پہنچتے ہی مسٹر کولا نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ اِدھر آؤ کچھ دکھلائیں۔ پھر سرندر کو بازو سے پکڑ کر انھوں نے کھڑکی کی اوٹ سے ایک جانب اشارہ کیا۔

سامنے مکان کی ایک نیم کھلی کھڑکی میں کھڑکی کا پردہ ایک جانب سرکائے آئینہ کھڑکی میں اپنے مقابل رکھے ایک فتنہ نظر دوشیزہ اپنے لمبے گھنگریالے بالوں کو آراستہ کر رہی تھی۔ بار بار اس کا سر آگے کی جانب جھکتا تھا۔ کنگھی والا ہاتھ بالوں تک پہنچتا تھا وہ جھٹکے سے سر کو بلند کرتی تھی۔ لانبی گردن میں ایک دلفریب خم پڑتا تھا اور سینہ میں سے اس انداز سے ابھرتا تھا کہ دل کانپ کانپ اٹھتا تھا۔

"کیوں ہے نا آگ" ـــــ مسٹر کولا نے سرندر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"جی، بر ہمچاری جی! ـــــ دیکھنا کہیں ہاتھ نہ جلا بیٹھنا"

"ایسی کہاں قسمت" ـــــ مسٹر کولا نے گہری لمبی سانس لیتے ہوئے کہا

"جلنا ہی مقصود ہے تو سراِ ٹ گزر جاؤ" سرندر نے ہنستے ہوئے کہا۔ یوں بند کمرہ میں سینہ سے سٹیم چھوڑنے سے فائدہ؟"

"چھوڑو بھی ان باتوں کو" مسٹر کولا نے دوبارہ ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا "شادی کرنا ہوتی تو آج سے آٹھ سال پہلے کرلی ہوتی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ شادی کا بار اٹھانے کی نہ اس وقت مجھ میں صلاحیت تھی نہ اب ہے۔"

"تو پھر یوں سرنگیں لگانے سے فائدہ"

لیکن پیشتر اس کے کہ مسٹر کولا کچھ جواب دیتے۔ اس کافر ادا دوشیزہ نے گیسو آراستہ کر چکنے کے بعد آئینہ ہاتھ میں لیکر چہرہ کے مقابل کیا۔ بالوں کی آرائش پر مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی۔ پھر خود مسکراتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی ـــــ رقص کرتی ہوئی کھڑکی سے ہٹ گئی۔

"پرنس ـــــ کیوں ہے نا شہزادی ـــــ" مسٹر کولا نے سرندر کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔

"خوب ہے" ـــــ سرندر نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

"خوب ہے۔ ـــــ اونہہ ـــــ" مسٹر کولا نے سرندر کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ ارے پرنس تمہیں ادیب کس کمبخت نے بنا دیا۔ مجھ سے پوچھو تو جغتائی کا سب آرٹ ناہید پر ختم ہے"۔

"کیا نام لیا؟" سرندر نے پہلی بار اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"ناہید اختر ـــــ ہائے نا ملکوتی نام" مسٹر کولا نے اسی جوش وخروش سے

جواب دے دیا۔

"ناہی سی ی ی دا" سرندر زیر لب گنگنایا اور اسے اپنی زبان پر ہلکی سی سیٹی بجنے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے دلی جذبات چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "نام تو لطیف ہے"

"اور خود لطیف تر ——— ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی" کہتے کہتے مسٹر کولا نے زور سے سرندر کی ہتھیلی پر ہاتھ مارا۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ سرندر نے بھی خاموش رہنا مناسب خیال نہ کیا اور مسٹر کولا کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔

۲

سرندر نے اس محلہ میں مکان محض اس لئے لیا تھا کہ وہ صنف نازک کے نیم کش تیروں کی خلش سہتے سہتے عاجز آ گیا تھا اور چاہتا تھا کہ چند یوم سکون سے بسر کر سکے اس محلہ میں چونکہ دو ایک پردہ دار مکانوں کے سوا باقی سب دکانیں تھیں۔ یا اُن جیسے مجردوں کے بالاخانے۔ اسلئے اُسے یقین تھا کہ یہاں نفسا نفسی کی تانیں اُڑیں تو اڑیں۔ بہرحال وہ نفسانیت کے حملوں سے محفوظ رہیگا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ ان پردوں میں بقول مسٹر کولا کے آگ لپٹی ہوئی ہے۔ جو اپنی ایک ہی لپک سے اس کے خرمن امن و سکون کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ اور اس کے دل میں جذبات کی ایک ایسی چنگاری روشن کرے گی کہ مضطربانہ کروٹیں اس کا مقدور ہو جائے گا۔ مسٹر کولا کے کمرہ سے چلے آنے کے بعد وہ کتنے ہی عرصہ یہ سوچتا رہا کہ اگر ناہید آتش سراپا تھی۔ تو اس کے لئے ہی اس کی زد میں آنا کیا لازم تھا۔ اس کے اعضا کی ہر ہر جنبش اگر قاتل تھی تو یہی کیا ضرور تھا کہ وہ ہی ان اداؤں کے لئے تختۂ مشق منتخب ہوتا۔ اور معاً اسے اپنی اس منطق

پرہنسی آئی - اُسے منتخب کس نے کیا ـــــ وہ تو خود ہی تختۂ مشق بننے کے لئے بیقرار ہو رہا ہے چاہے اُسے کوئی منتخب کرے یا نہ کرے ـــــ اور اسے کرے گا ہی کون ؟ ـــــ ان تیر کی طرح چبھ جانے والے نقوش سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسکے جذبات کو سہلائیں گے - حماقت سے کیا کم ہے - ایکا ایکی اسکی نگاہوں کے سامنے ناہید کی لانبی لانبی پلکیں - اسکے کمان کی طرح جھکے ہوئے ابرو اور اسکے سانپ کی طرح بل کھائے ہوئے گیسو گھومنے لگے اور معاً اسے خیال آیا - یہ جو شاعر لوگ لانبی لانبی بل کھائی ہوئی زلفوں کو کالے سانپوں سے تشبیہ دیتے ہیں - تو کیا بُرا کرتے ہیں - یہ کمان کی طرح جھکے ہوئے ابرو ـــــ خنجر نہیں تو اور کیا ہیں - اور یہ لانبی لانبی نوکیلی پلکیں - اور اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے محسوس کیا - جیسے وہ لانبی لانبی پلکیں تیروں کی صورت اختیار کرتی جاتی ہیں - اور وہ تیر اسکے دل کو نشانہ بنائے ہوئے فضا میں لہراتے ہوئے اسکی جانب بڑھ رہے ہیں - وہ لانبے لانبے سیاہ نوکیلے تیر اور وہ شدت احساس سے کانپ اٹھا - اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں - وہ لانبے لانبے سیاہ تیر واپس لوٹ چکے تھے - کمرہ خالی اور سنسان تھا - صرف روشنی کی ایک تیز لکیر روشندان کو چیرتی ہوئی اس کے چہرہ پر پڑ رہی تھی - یا شاید یہ کسی کافر ادا دوشیزہ کی ٹکٹکی لگی ہوئی نگاہ تھی - اس نے بڑھ کر روشن دان کا کپڑا پھیلا دیا لیکن روشنی کی اس کرن کے رکتے ہی اسے کمرہ کی فضا حابس محسوس ہونے لگی - وہ گھبرا کر کمرہ سے باہر نکل آیا - اور تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا - لیکن یہاں شاید قدرت کو اُسے ایک اور آفت میں مبتلا کرنا تھا - اپنے مکان کی چھت پر کھڑی ناہید انگڑائی لے رہی تھی - سرندر کو دیکھتے ہی اسکے اٹھے ہوئے ہاتھ پہلو میں گر گئے - سرندر کو یوں محسوس ہوا کہ یہ ناہید کی انگڑائی نہیں ٹوٹی بلکہ اسکے سینہ پر سینکڑوں ستم ٹوٹے ہیں - ایک لمحہ کے لئے دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں - دونوں

بیک وقت ٹھٹک کر پیچھے ہٹے۔ پھر سرندر تو کھڑا مسکراتا رہا۔ لیکن ناہید شرما کر جھینپ کر لچک کر ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی تیزی سے سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔ ایک لمحے کیلئے سرندر کو نگاہوں میں چکا چوند سی محسوس ہوئی۔ پھر یک لخت تاریکی چھا گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے زور سے دونوں ہاتھوں سے ملیں۔ لیکن آنکھوں کو کھولنے پر بھی اُسے چہار سو تاریکی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یکایک قدرت نے ماتمی لباس پہن لیا اور سنسناتی ہوئی ہوا اس کے کانوں میں سرد آہیں پھونکنے لگی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کیلئے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ عین اس وقت کلاک نے ٹن ٹن چھ بجائے۔ سرندر کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے گھنٹہ کی ایک ایک ضرب اسکے دل پر پڑ رہی ہے اور ہر ضرب کے ساتھ اسکا دل کلبلا کلبلا اٹھتا ہے۔ اُسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں گھنٹہ کی آخری ضرب اس کے دل کی آخری دھڑکن ثابت نہ ہو۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ گھنٹہ اپنی آخری ضرب لگائے وہ ایک ضرب خوردہ پرندہ کی طرح پلنگ پر گرا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ کو تھام کر رہ گیا۔

. . . .

وہ رات سرندر نے بستر پر کروٹیں لے لے کر کاٹی۔ دوسرے دن صبح جب وہ بیدار ہوا تو ایک عجیب طرح کی گرانی اسکے ہر ہر اعضا پر مسلط تھی۔ اس نے ایک کسلمندانہ انگڑائی لی اور پھر سے آنکھیں بند کر کے خوابوں کی حسین دنیا میں جانیکی کوشش کی۔ دفعتاً قریب ہی سے ایک کوے نے کائیں کائیں کی۔ وہ تلملا کر اٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا۔ خدا اگر کوے کو نہ بناتا تو اسکا کیا ہرج تھا۔ کوئل کو دیکھو کوا اس کی طرح کالی ہے لیکن کیسی میٹھی آواز رکھتی ہے اور بلبل . . . . اور تو اور یہ چڑیاں بھی جب چہچہاتی ہیں۔ تو ایک سہانی صدا پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کمبخت کس زور سے چیختا ہے۔ جیسے کاٹ ہی تو کھائے گا۔ اور اس نے بازو کی ایک جنبش سے

کوے کو اڑا دیا۔ اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرہ پر کھل اٹھی لیکن وہ مسکراہٹ جاتے جاتے اپنی یادگار ایک غمناک پریشانی چھوڑ گئی۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی کے درمیان نہ ایک دردناک قوس کھچ گئی۔ اور اس نے افسردہ نگاہوں سے ناہید کے کوٹھے کی جانب دیکھا۔ بالائی منزل کی چھت پر اونچے اونچے پردوں کے درمیان نہ معلوم وہ رشک ناہید محو خواب تھی یا اس کی طرح انگڑائیاں توڑ رہی تھی اور وہ سوچنے لگا، ناہید کے گھر والے تیسری منزل کی چھت پر کیوں سوتے ہیں جب کہ دوسری منزل پر ضرورت سے زیادہ کشادہ جگہ موجود ہے۔ اے کاش کہ کوئی ان کے دماغ میں یہ بات گھسیڑ دے اور وہ آج سے تیسری منزل کی چھت کی بجائے دوسری منزل پر سونا شروع کر دیں۔ اے کاش۔ اور اس کے ایک بیقرار نگاہ تیسری منزل کی چھت پر ڈالی۔ پردوں کے سوراخوں میں اُسے لاکھی رنگ کا ایک آنچل سرکتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جھٹ سے یقین کر لیا کہ یہ آنچل والی ناہید ہے۔ اور خود بخود ایک گہری سانس اسکے دہن سے نکل گئی۔ وہ آنچل سرسراتا ہوا غائب ہو گیا اور اس کے دل کی دنیا پھر سے تاریکی چھانے لگی۔ وہ اٹھا اور بیقرار ہو کر چھت پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ معاً اُسے دوسری منزل پر پھر سے لاکھی دوپٹے کی جھلک نظر آئی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا جنگلے کی جانب بڑھا لیکن پیشتر اس کے کہ وہ جنگلہ کے قریب پہنچتا وہ لاکھی دوپٹہ سرکتا ہوا سیڑھیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ دست تاسف ملتا ہوا واپس لوٹا۔ اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا اپنے کمرہ میں پہنچ گیا۔

اس دن کالج میں بھی سرنار کچھ کھویا کھویا سا رہا۔ اور جب واپس آیا تو ایک سکون مضمحل اس پر طاری تھا۔ لب خاموش جیسے سلے ہوئے۔ اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی۔ لیکن وہ حد سے زیادہ کھلی ہوئی آنکھیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھ رہی تھیں اور وہ خاموش لب نہ معلوم چپکے چپکے اس کے دل سے کیا باتیں کہہ رہے تھے۔ کہ رہ رہ کر اس کا دماغ

کھول اٹھتا تھا۔ کتابیں ایک جانب پھینکنے کے بعد وہ اسی طرح پتلون پہنے پلنگ پر دراز ہوگیا۔ سر پر زور سے رومال باندھا۔ صراحی سے انڈیل کر ایک گلاس پانی پیا۔ بجلی کے پنکھے کا رخ اپنی جانب کیا اور دماغ سے پریشان خیالات کو نکالنے کے لئے زور سے آنکھیں موندلیں۔ پھر شاید قدرت کو ہی اس پر رحم محسوس ہوا کہ وہ بہت جلد نیند سے ہم آغوش ہوگیا۔

اُسے جب ہوش آیا تو کلاک ٹن ٹن چھ بجا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ ناہید اپنے مکان کی چھت پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اور یہ کلاک کی ٹن ٹن محض اسکا بلاوا ہے۔ یا شاید وہ کلاک کی زبان سے کہہ رہی ہے کہ کل تو تم اس وقت سے پہلے ہی چھت پر پہنچ گئے تھے۔ آج یہ دیری کیوں کیوں کیوں ـــــ اور وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔

اپنے مکان کی چھت پر کھڑی ناہید بیقرار نظروں سے سرندر کے مکان کی چھت کی جانب دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں چار ہوئیں۔ ایک دلفریب مسکراہٹ سرندر کے لبوں پر کھل اٹھی۔ ناہید ایک لمحے کے لئے جھجکی۔ پھر اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ لیکن وہاں سے چلے جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

چند یوم گزر گئے اور یہ نظر بازی کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ ایک روز سرندر کو جو شوخی سوجھی تو اس نے ناہید کے سینہ کا نشانہ باندھ کر ایک چاکلیٹ پھینکا۔ لیکن بجائے اسکے کہ ناہید برہم ہوتی۔ اس نے چاکلیٹ اٹھا کر ورق اتار کر منہ میں ڈال لیا۔ پھر تو وقت بے وقت فضا میں چاکلیٹ اڑنے لگے اور سرندر کی الماری میں رکھے ہوئے ڈبے جلد جلد خالی ہونے لگے۔ لیکن ابھی تک یہ معاملہ چاکلیٹوں کی حد سے نہ بڑھا تھا کہ ایک روز . . . . دوپہر سرندر اپنے کمرہ میں بیٹھا مطالعہ میں مشغول تھا کہ اس کے کمرہ کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلا اور دس سال کا ایک

خوبصورت لڑکا کمرہ میں داخل ہوا اور اندر قدم رکھتے ہی کہنے لگا ۔

"لالہ جی ——— کیا وقت ہے ؟"

سرندر کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ اس خورد سال لڑکے نے اسے لالہ جی کیوں پکارا ۔ وہ ہنوز بیس برس کے لگ بھگ تھا لیکن اس دس بچے کی نظروں میں وہ اتنا بڑا کیسے ہو گیا کہ اس نے اُسے لالہ جی کہہ کر بلانا درست سمجھا ۔ شاید اس کا باعث وہ ماحول ہو جس میں اس بچے نے پرورش پائی ۔ اور جہاں سب ہندو لالہ تصور کئے جاتے ہیں اور چھوٹے بڑے کی تمیز ہی ہٹا دی جاتی ہے ۔

"ایک بجکر بیس منٹ" سرندر نے رسٹ واچ پر نگاہیں ٹولتے ہوئے جواب دیا ۔

جواب پا کر بھی وہ لڑکا وہیں کھڑا رہا ۔ اور پھر خود ہی ایک لمحہ بعد کہنے لگا ۔

"وہ پوچھتی ہیں"

"کون ؟" سرندر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا ۔

"وہ"

"وہ کون ؟"

"وہ سامنے"

اور سرندر نے اس لڑکے کا اشارہ سمجھتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اس چلچلاتی دھوپ میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑی ناہید سرندر کی کھڑکی کی جانب دیکھ رہی تھی ۔ وہ ہلکے تربوزی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی ۔ اس کے سرخ و سپید رخسار گرمی کی تپش سے انگارہ بن رہے تھے اور یہ معلوم نہیں پڑتا تھا کہ کہاں جا کر اس کے رخساروں کی سرخی اس کے دوپٹے کی رنگت میں مدغم ہو گئی ہے ۔ سرندر کو دیکھتے ہی وہ مسکرائی اور مست پیاری نظروں سے اس کی جانب دیکھا ۔ سرندر نے بھی اس کی نظروں کا اسی انداز میں جواب دیا ۔ پھر ایکا ایکی کسی خیال کے آنے سے اس نے

تپائی پر پڑی ہوئی ٹائم پیس اٹھا کر کھڑکی میں اس کا رُخ ناہید کی جانب کر دیا۔ ناہید کچھ دیر ٹکٹکی باندھے ٹائم پیس کی جانب دیکھتی رہی لیکن شاید سورج کی تیز کرنوں نے شیشہ پر منعکس ہو کر اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی کہ کافی دیر دیکھنے کے باوجود وہ وقت سمجھنے سے قاصر رہی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی معذوری ظاہر کی تو سرندر نے دونوں ہاتھ منہ کے گرد رکھ کر تیز سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ایک بجکر بیس منٹ"

نہ معلوم اس خورد سال لڑکے کو کھڑے کھڑے کیا بات یاد آئی کہ اس نے سرندر کے قریب آ کر کہا۔

"ہمیں پانچ بجے شاہو کی گڑھی جانا ہے۔"

"اچھا" سرندر نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کون کون جائے گا۔"

"میں جاؤں گا اور آپا جائے گی۔"

"اور کون جائے گا۔"

"اور تو سب صبح ہی چلے گئے ہیں۔ آپا میرے لئے رہ گئی ہے۔ کیونکہ میں سکول گیا ہوا تھا۔"

"اچھا" اور سرندر نے ایک بار پھر کھڑکی سے ناہید کے کوٹھے کی جانب جھانکا لیکن ناہید شاید چلچلاتی ہوئی دھوپ برداشت نہ کر سکی تھی۔ اس لئے سرندر کی نگاہوں کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اس نے دوبارہ لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے"

"شوکت"

"اچھا تو تم ٹھیک پانچ بجے جاؤ گے۔"

"جی۔ اور آپا کہتی تھیں۔ آپ کو اچھی طرح سمجھا آؤں۔"

"کیا؟"

"کہ ہم دونوں ہی شاہو کی گھڑی جائیں گے۔"

"ہوں" سرندر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"اچھا سلام" اور کہتے کہتے شوکت سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ معاً کسی خیال سے آنے سے سرندر نے شوکت کو ٹھیرنے کے لئے کہا۔ پھر بڑھ کر مٹھی بھر چاکلیٹ اس کی پاکٹ میں ڈال دیئے۔ اور ایک چونی اس کی ہتھیلی پر رکھدی اور شوکت مسکراتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اتر کر غائب ہو گیا۔

شوکت کے چلے جانے کے بعد ایکا ایکی سرندر کو محسوس ہوا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ ناہید کا پیغام اس کی توقع سے زیادہ امید افزا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ غنچہ نو دمیدہ چاہتی تھی کہ اس کے حسن کی نزہت باریوں سے سرندر لذت یاب ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ سرندر اس کے ساتھ آج شام کے پانچ بجے یہاں سے چلے اور پھر شاہو کی گڑھی پہنچنے سے پہلے کسی ہوٹل یا ریسٹوران میں کمرہ کرایہ لے کر۔۔۔۔۔۔ اور اسکے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کا دماغ آنے والے واقعات کے تصور ہی سے جھوم اٹھا۔ اس نے کتاب اٹھا کر زور سے پلنگ پر دے ماری اور بے اختیار ہو کر کمرے میں ناچنے لگا۔

چار بجے کے قریب اس نے نیا سوٹ نکالا۔ صبح شیو کر چکنے کے باوجود دوبارہ شیو کی۔ بالوں میں سے پھر سے کوئی کا تیل جذب کیا۔ سوٹ سے ملتی جلتی ٹائی نکالی اور اُسے عطر میں بسایا اور ساڑھے چار بجے سے قبل تیار ہو کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا کتاب ہاتھوں میں لی اور بیزاری کے سے انداز میں پڑھنے لگا۔

معاً اسے سامنے مکان کھڑکی کھلنے کی صدا آئی۔ اس نے نگاہیں اُٹھا کر کھڑکی کی

جانب دیکھا ۔ ناہید نے کھڑکی کا پردہ سرکاتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور اسے تیار دیکھ کر مسکراتی ہوئی پردہ کے پیچھے غائب ہوگئی ۔

ابھی پانچ بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ شوکت تانگہ لے آیا ۔ اور اس کے چند ہی لمحوں بعد وہ مخمور جوانی گہرے نیلے رنگ کے ایرانی نژاد برقعہ میں لپٹی ہوئی نہایت سبک روی سے چلتی ہوئی آکر تانگہ میں بیٹھ گئی ۔ برقعہ کا ایک گوشہ اٹھا اور سرندر نے دیکھا کہ وہ غزالی آنکھیں اس کی متلاشی ہیں ۔ اس نے جلدی سے کمرہ میں تالا لگایا ۔ اور تیز تیز سیڑھیاں اترتا ہوا ، ڈیوڑھی پھاندتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچ گیا ۔

"پرنس" — کسی نے پیچھے سے پکارا ۔ اور سرندر نے مضطرب ہو کر مڑ کر دیکھا کہ ڈیوڑھی میں ایک جانب مسٹر کولا کمان بنے سائیکل کو تالا لگا رہا تھا ۔ سرندر کا رخ اپنی جانب دیکھتے ہی وہ چلایا ۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو؟"

"ابھی آیا" کہتے کہتے سرندر نے چاہا کہ دروازہ پار کر کے گلی میں پہنچ جائے ۔ کہ مسٹر کولا زور سے چلایا ۔

"پرنس —— ارے یار ٹھیرو بھی ۔ ایک اشد ضروری کام ہے"

"کیا ہے" سرندر نے بیزار ہوتے ہوئے کہا ۔

"ارے یار سنو تو" اور مسٹر کولا نے سرندر کے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں کہا "یہ ناہید اور اس کا بھائی آج تانگہ میں سوار ہو کر کہیں تنہا باہر جا رہے ہیں آؤ ہم بھی تانگہ لے کر ان کا تعاقب کریں"

اور سرندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل میں سیسہ بھر دیا ہے اور وہ نیچے ہی نیچے بیٹھا چلا جا رہا ہے ۔ وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا ۔ اسے اپنی آرزوؤں کا قصر عظیم منہدم ہوتا محسوس ہوا ۔ اس نے گھبرا کر تانگہ کی جانب نگاہ کی ۔

اُسے برقعہ کی اوٹ سے دو بیقرار نظریں تڑپتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے سینہ سے ایک ہوک سی اٹھی۔ اس نے تلملا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ ایک لمحہ بعد جب اس نے زبان کھولی تو خود اپنی آواز اُسے غیر مانوس سی محسوس ہوئی۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا دوست"

"عجیب بزدل ہو" کولا نے سرندر کی بے حسی پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعے بھی کہیں ہاتھ سے کھونے کے ہوتے ہیں!"

"یہ بات نہیں ہے دوست۔۔۔۔" لیکن پیشتر اس کے کہ سرندر کچھ اور کہتا تانگہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرندر کے قریب سے گزر گیا۔ سرندر نے دیکھا وہ نیچی نگاہیں اب بھی برقعہ کی اوٹ سے اُسے کچھ پیغام دے رہی تھیں۔ اُسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ دماغ میں تانگہ کے پہیے تیزی سے چکر کھاتے محسوس ہوئے۔ اس کا سر زور سے چکرایا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے پیشانی کو تھامتے ہوئے کہا۔

"میری طبیعت پریشان ہو رہی ہے۔"

"اوہ یہ بات ہے" مسٹر کولا نے سرندر کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "چلو اوپر چلیں" اور کہتے کہتے مسٹر کولا نے اپنا بازو سرندر کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ اور اسے تھامے ہوئے سیڑھیوں کی جانب لے چلا۔ سرندر نے مڑتے مڑتے دیکھا بنگلے کی موڑ کے قریب تانگہ رُک گیا تھا۔ اور نیلے برقعہ کی اوٹ سے نکلے ہوئے ایک سپید بلوریں ہاتھ میں ایک سپید کریپ کا رومال ہلکی جنبشوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے تلملا کر آنکھیں بند کر لیں نچلے ہونٹ کو زور سے کاٹا اور اپنا سب بوجھ مسٹر کولا پر ڈال دیا۔

۳

دوسرے دن جب سرندر کالج میں گیا تو اس کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی اُسے

ٹہلنے سے بھی جو بیٹھتا تو وہ لڑھکتا ہوا کہیں جا رہتا۔ اس کا جسم ایک ناقابلِ فہم قلبی ہیجان کے باعث اس کے قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ قدم کہیں رکھتا تھا اور پڑ کہیں رہا تھا قدم قدم پر اُسے اپنے سامنے ستاروں کے غبار اڑتے نظر آتے تھے۔ اور تو اور خود اسکے دماغ میں ستارے ناچ رہے تھے اور شاید ان میں سب سے منور ستارہ خود ناہید تھی۔ یکایک اُسے دماغ میں ایک چیخ سی محسوس ہوئی اور اس نے خیال کیا جیسے وہ ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ وہ چلتے چلتے ایک ستون سے ٹکرا گیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے اُسے ایک چنگاری سی اڑتی نظر آئی جیسے کوئی ستارہ ٹوٹ کر روشنی کی ایک لمبی سی لکیر اپنے پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ وہ سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور اگر اس کا ایک دوست اُسے دیکھ کر سہارا دیکر ایک بنچ پر نہ لٹا دیتا تو شاید وہ وہیں فرش پر چت ہو جاتا۔

کہیں کہیں روحانی مرضوں میں غیر روحانی علاج نہایت مفید بیٹھتے ہیں۔ نمک اور کالی مرچ ملی سوڈا سکنجبین کے دو گلاسوں نے سرندر کے کھولتے ہوئے دماغ کو کافی سکون بخشا اور وہ دوسرے پیریڈ کے وقت اس قابل ہو گیا کہ کلاس میں بیٹھ کر لیکچر سن سکے لیکن لیکچر ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ چپڑاسی نے آکر پروفیسر کو ایک چٹ دی اور پروفیسر نے پڑھتے ہی کہا۔

" مسٹر سرندر تمہیں کوئی خاتون باہر بلا رہی ہیں "

سرندر گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ پروفیسر کے کہنے کا مدعا کیا ہے۔ کوئی خاتون بلاتی ہے۔ مجھے۔ کون خاتون بلا سکتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا کتابیں اٹھا کر باہر چل دیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ یہ خاتون کہیں ناہید نہ ہو۔ اور اس کا دل سینے میں ایسے طرح اچھلنے لگا۔ ناہید اُف ــــ وہ محبوب تمنا۔ اور اس سے زیادہ اس نے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی

اور تیز تیز چلتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ گیٹ کے اس جانب ایک دلکش زمردیں کار کے قریب زمردیں ساڑھی پہنے ہوئے ایک غیرتِ ناہید کھڑی تھی۔ سرندر اسے پہچانتے ہی چیخ اٹھا۔

"اوہ اُرلی ـــ تم ـــ" کہتے کہتے اس نے ارملا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبا دیا۔

"شکر ہے کہ تم مل گئے آخر کار" ـــ ارملا نے مسکراتے ہوئے کہا

"کس نے بتلایا تمہیں کہ میں یہاں پڑھتا ہوں" سرندر نے بدستور متعجب نظروں سے ارملا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس معلوم ہو گیا" ـــ ارملا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر بھی"

"پیچھے بتاؤں گی" ارملا نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "اب چلو"

"کہاں" سرندر نے اور بھی حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہیں کسی ریسٹورنٹ میں چائے وغیرہ پئیں گے اور باتیں بھی کریں گے"

"اوہ ـــ اچھا۔ اچھا ـــ" سرندر نے موٹر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ پھر ایکا ایکی اُسے بھولے بسرے دنوں کی یاد آگئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک شوخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل اٹھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے سمجھا شاید گھر گھر کھیلنے چلیں گے"

"گھر گھر" اور ارملا نے بیٹھتے ہوئے ایک گہری لمبی سانس لی۔ "اے کاش سرندر تم کھو نہ جاتے تو شاید یہ کھیل ہمیشہ کھیلا جاتا" پھر ایک غمناک انداز میں شانے ہلاتے ہوئے اس نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ سرندر نے دیکھا ایک لمحہ پہلے کھلکھلاتی ہوئی ارملا کا چہرہ اب سوکھے پتے کی طرح زرد ہے۔ اس نے چند لمحہ تیز نظروں سے

ارملا کے چہرہ کی جانب دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے سر کو سیٹ کی پشت پر ڈال دیا۔ اسے رہ رہ کر وہ ننھی ارلی یاد آ رہی تھی۔ جو اس کی الماری سے کھیلوں کی چیزیں اٹھا کر بھاگ جایا کرتی تھی۔ بھوری سی ٹاپٹی ٹاپتی خوشی سے ٹاپ اٹھتی تھی اور زور زور سے تالی بجانے لگتی تھی جو ایک مدت تک اس کے ساتھ باغ کے اس تاریک سنسان گوشے میں گھر گھر کھیلتی رہی تھی کسے معلوم تھا کہ وہ ننھی سی معصوم کلی اتنی جلدی نکھر کر ایک شگفتہ پھول بن جائے گی۔ جسے توڑنے کے لیئے وہ بیقرار ہو اٹھے گا۔ اور اسے اپنے سینے سے ایک ہوک سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک دزدیدہ نگاہ ارملا کے چہرہ پر ڈالی اسکے ساتھ ہی ارملا کے ماتھے کی بندی اس کے دل میں بے طرح کھٹکنے لگی۔ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی اور پھر سے آنکھیں بند کر کے سر کو سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔

موٹر ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ ارملا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو"

"سوچ رہا ہوں قدرت بھی کس قدر ستم ظریف ہے"۔ سرنار نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر ایک اچٹتی نگاہ ارملا کے چہرہ پر ڈالی۔ اس کی حیرت نے دیکھا۔ ارملا پھر پہلے کی طرح مسکرا رہی ہے

اس نے موٹر سے اترتے ہوئے کہا

"جاؤ بھی اُرلی۔ تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔"

"اب آئس کریم کھلاؤں گی ـــــ طبیعت درست ہو جائے گی"۔ کہتے کہتے ارملا اپنی مست البیلی چال سے سٹینڈرڈ میں داخل ہو گئی اور پیچھے سرندر بھی ہال کے سرے پر ایک علیحدہ باکس میں بیٹھے ہوئے ارملا نے ویٹر سے دو گلاس آرنج سکویش" Orange Squash "اور پیسٹری لانے کے لئے کہا۔ پھر تپائی پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیا ہو رہا ہے تمہیں"

"کچھ نہیں" ــــ سرندر نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا ملنا بار خاطر تو نہیں گزرا"

"کیسی باتیں کر رہی ہو ارملا۔ تمہیں ملنے کے لئے تو میں پشاور گیا تھا"

"سچ"

"جی"

"پھر"

"معلوم ہوا کہ تمہارے بنگلہ میں کوئی مسٹر کپلا رہتے ہیں"

"پھر تو بیحد پریشان ہوئے ہو گے"

"پریشانی کی پوچھتی ہو۔ میرے لئے وہاں ایک لمحہ بسر کرنا محال ہو گیا۔ بس اسی روز شام کی گاڑی سے واپس راولپنڈی چلا آیا"

"یہ کب کی بات ہے"

"پچھلی گرمیوں کی"

"ارے تب ہی تو میں نے بھی تمہاری تلاش میں تھک کر زندگی کی بازی ہار دی تھی"

"وہ کیسے"

اور پیشتر اس کے کہ ارملا کچھ جواب دیتی۔ ویٹر پیسٹری اور آرنج سکولیش لے کر آ گیا۔ سرندر نے سب سامان تپائی پر رکھواتے ہوئے دوبارہ ایک تیز نگاہ ارملا کے چہرہ پر ڈالی۔ اس کے چہرہ پر پھر سے وہی افسردگی چھا گئی تھی جو اس نے موٹر میں بیٹھتے ہوئے دیکھی تھی۔ اس نے ایک گلاس ارملا کی جانب سرکاتے ہوئے دل ہی دل میں خیال کیا یقیناً ان نیلگوں نگاہوں کی گہرائیوں میں کوئی غمناک افسانہ کروٹیں لے رہا ہے۔ اس نے

دوسرا گلاس اپنی جانب سرکاتے ہوئے کہا۔

"ارملا"

"جی" — ارملا جیسے چونک سی اٹھی۔

"تم نے بتلایا نہیں کہ تم زندگی کی بازی کیسے ہار بیٹھیں"۔

"اب سن کر کیا لوگے سرندر۔ تیر ہاتھ سے چھوٹ کر واپس نہیں لوٹا کرتے"۔

"تو میرے پیچھے تم تیر چلاتی رہی ہو۔"

"ہاں جنھوں نے میرا انگ انگ گھائل کر دیا ہے"۔

"ارملا!" سرندر نے بیقرار ہوتے ہوئے کہا۔

"جی" — ارملا نے نگاہیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور سرندر نے دیکھا کہ ان نیلگوں نگاہوں میں چھائی ہوئی گھٹائیں اب برسنے پر تل آئی ہیں۔ اس نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

"ارملا تمہیں میری جان کی قسم اگر سب سچ سچ نہ کہو"۔

"سرندر۔ یہ تم اچھا نہیں کر رہے"۔ ارملا نے گلاس ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا اور پھر ایک لمحہ بعد . . . . اچھا سنو۔

اور سرندر ارملا کی تنبیہ کی پروا کئے بغیر مجسم توجہ بن گیا۔

ارملا کہنے لگی "تم چلے آئے اور میری خوابوں کی دنیا اجڑ گئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھی کہ یہ سب وقتی فریب ہے۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے تمہاری یاد میرے دل میں گہری ہوتی گئی۔ پھر ہم لاہور چلے آئے۔ یہاں آتے ہی میری شادی کے پیغام آنے لگے۔ لیکن میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹالتی رہی۔ آخر پچھلے سال میرا منشا سمجھتے ہوئے پتاجی نے یہی مناسب سمجھا کہ میں اپنا 'بر' خود تلاش کر لوں۔ ممی بھی راضی ہو گئیں اور میں تمہیں تلاش کرنے نکل پڑی"۔

"ارملا" سرندر نے ارملا کے بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اب روکو انہیں سرندر" ارملا نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا "ورنہ میرا ضبط ٹوٹ جائے گا۔ اور میں پھوٹ پڑوں گی"

"اچھا کہو"

"تم پشاور سے راولپنڈی گئے تھے۔ میں سیدھی راولپنڈی پہنچی۔ وہاں تمہارے والد کے دفتر سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ تمہارے والد صاحب سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ تم رہتے کہاں ہو۔ تنگ آکر میں نے گلی گلی گھومنا شروع کر دیا۔ کئی دن تو صبح شام کمپنی باغ کے گیٹ کے قریب چکر کاٹتی رہی کہ شاید تم سیر کے لئے ادھر آنکلو۔ لیکن تم تو ان دنوں پشاور گئے تھے ملتے کیسے۔ تھک ہار کر آخر میں لاہور چلی آئی۔ اور والدہ سے کہہ دیا کہ وہ جہاں بھی چاہیں میری شادی کر دیں پچھلے بیساکھ میں میری شادی ہو گئی اور آج شادی سے ٹھیک ایک ماہ بعد ایک رسالہ میں تمہارا ایک مضمون دیکھا۔ ساتھ ہی فوٹو بھی تھا اور نیچے تمہارا پتہ درج تھا بس میں تمہارے کالج پہنچ اور خوش قسمتی سے تم مل گئے۔

"یا بدقسمتی سے" سرندر نے ایک گہری لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب آہیں بھرنے سے حاصل" ارملا نے سنبھلتے ہوئے کہا "یہ غم کے کچھ کم کیا میں نے کم کھائے ہیں کہ تم اپنی جان ہلکان کرنے لگے ہو۔

"کاش ارملا تم مجھے ڈھونڈنے کے لیے اخبار میں اشتہار نکلوا دیتیں"

"یہ سوجھی مجھے بھی۔ لیکن آج تمہارا مضمون دیکھ کر"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ پیسٹری یونہی پلیٹوں میں دھری رہی۔ سکوئش گلاسوں میں جھلکتی رہی۔ اور چند لمحے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور بل ادا کر کے موٹر میں سوار ہو گئے۔

اور پہلی بار ارملا نے زبان کھولی۔

"کہاں چلوگے؟"

"گھر"

"کہاں سے رکھا ہے؟"

"گوالمنڈی میں"

"ماتا جی بھی ہیں؟"

"نہیں۔"

"موٹر سرندر کے دروازہ پر رکی۔ تو سرندر نے اترتے ہوئے کہا۔

"آؤ ارملا۔ اوپر بیٹھیں۔"

"نہیں سرندر" —— ارملا نے صورت انکار سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس وقت نہیں۔ اس وقت تو میں جی بھر کر رونا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر آؤ دونوں مل کر روئیں گے۔

"سرندر؟"

"ارملا!" اور سرندر نے کچھ ایسی حسرت بھری نظروں سے ارملا کی جانب دیکھا کہ ارملا کو مجبور ہو کر اترنا ہی پڑا۔ کمرہ میں پہنچکر سرندر نے بجلی کا پنکھا چھوڑ دیا اور پھیٹا ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔

"اس پنجرہ میں آکر طبیعت گھبرا گئی ہوگی؟"

"کاش کہ ان بڑی بڑی کوٹھیوں کی بجائے مجھے یہ کمرہ نصیب ہوتا۔"

"تو آج کل بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں آپ" سرندر نے ظاہر دارانہ خلوص کے انداز میں کہا۔

"جی"

"میں پوچھ سکتا ہوں کہاں؟"

"میاں میر —— نہر کے اس پار"

"میں ان کا نام بھی پوچھ سکتا ہوں؟"

"مسٹر ٹی۔ سی۔ جوشی۔ ایل۔ بی؟"

"او مسٹر جوشی معاف کرنا۔ باتوں باتوں میں یہ پوچھنے کا خیال ہی نہ رہا۔ کہ آپ کیا پینا پسند کریں گی؟"

"سریندر!"

"جی"

"اب طعنوں پر اُتر آئے۔"

"نہیں اُرملا" سریندر نے نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تو محض گذشتہ واقعات کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں میں بھول جانا چاہتا تھا۔ کہ میرے سامنے وہی ارملا بیٹھی ہوئی ہے۔ جو مدتوں میرے ساتھ باغ کے اس ویران گوشہ میں گھر گھر کھیلتی رہی ہے" کہتے کہتے سریندر نے منہ دوسری جانب پھیر کر رومال سے پلکوں پر اُمنڈتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔

"پاگل ہو رہے ہو سریندر" ارملا نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا "یہ بچوں کی طرح رونا تمھیں اچھا نہیں لگتا"

"مجھے چند لمحہ رو لینے دو ارملا۔ شاید پھر میری طبیعت سنبھل جائے"

"یہ گھر بلا کر اچھی خاطر ہو رہی ہے ہماری" ارملا نے سریندر کو خاموش کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"او معاف کرنا ارملا" —— سریندر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا —— پھر چاہا کہ کھڑکی کھول نیچے دکاندار سے سودا وغیرہ لانے کے لئے کہے۔ کہ ارملا نے روکتے ہوئے کہا۔

"بازار سے کچھ مت منگواؤ۔ جو کچھ گھر میں موجود ہے کافی ہوگا"

"گھر میں تو صراحی کا پانی بھی وسٹو سے اچھا ہوتا ہے۔"

"ارملا!"

"جی"

"تم اسے اپنا گھر کہہ رہی ہو"

"تو اور کیا کہوں"

"سرندر چپکے سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے خیالات بھاگتے ہوئے اسی باغ کے ویران گوشہ میں پہنچ گئے۔ اُسے اس اینٹوں کے گھروندے کی بے سروسامانی یاد آئی۔ اور اس نے خیال کیا۔ اس بے سروسامانی میں جو لذتیں تھیں۔ کیا وہ یہاں میسر نہیں آسکتیں۔ اور ایکا ایکی اُسے اپنے سینے میں ایک طوفان سا اُٹھتا محسوس ہوا۔ اُس نے نگاہیں ارملا کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"ارملا"

"جی"

"ایک بات کہوں برا تو نہ مناؤ گی"

"نہیں تو"

"سرندر!"

"آؤ گھر گھر کھیلیں"

"سرندر!"

"ہاں ارملا۔ ایک بار فقط ایک بار آج زندگی میں آخری بار ہم یہ کھیل کھیل لیں۔"

"سرندر"

"دیکھو ارملا مجھے مایوس مت کرو۔"

"سرندر!!!"

"ارملا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"اعتبار؟ — ارملا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔" اعتبار تو ہے... لیکن ...."

"معاف کر دو ارملا۔" سرندر نے خود کو پلنگ پر گراتے ہوئے کہا۔" میں غلط سمجھا تھا۔"

"تم اب بھی غلط سمجھ رہے ہو سرندر۔" ارملا نے سرندر کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔" مجھے تم پر اعتبار ہے۔ اپنے آپ پر نہیں۔" اور کہتے کہتے ارملا نے اپنا چہرہ سرندر کے بازو کی اوٹ میں چھپا لیا۔

"تو بھی مجھ پر بھروسہ رکھو۔ ارملا۔" سرندر نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ کھیل کھیلیں۔" اور ارملا کے جواب کی ضرورت محسوس کئے بغیر وہ الماری کے قریب پہنچ گیا۔

اتفاقاً گھر پر کچھ لیچی اور آلو بخارا موجود تھا۔ سرندر نے تھرماس سے برف نکالی۔ اور پلیٹ میں لیچی اور بخارا رکھ کر اوپر برف ڈال دی۔ ارملا پھٹی پھٹی نظروں سے سرندر کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی لیکن منہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ اس پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری تھی۔ جیسے کسی ساحر نے اس پر کوئی سحر پھونک دیا ہو۔ پلیٹ تپائی پر رکھ کر اس کے قریب لائی گئی۔ تو اس نے ایک سحر زدہ انسان کی طرح ایک آدھ لیچی چھیل کر کھائی۔ سرندر نے بھی مجبور کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ ادھر ارملا نے پھل سے ہاتھ کھینچا۔ ادھر اس نے بازو سے کھینچ کر ارملا کو پلنگ پر اپنے پہلو میں لٹا لیا۔ پھر دونوں بازو ارملا کی کمر کے گرد ڈال کر اسے زور سے سینہ سے کھینچ لیا۔ اور کافی عرصہ تک اسے اسی طرح سینہ سے بھینچے رہا۔ اس کی چھاتی دو آتشہ پستانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اور اسے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ کہ ان خاموش پستانوں کے پیچھے پردہ

پیہم زلزلہ سے جھٹکے آ رہے ہیں۔ اور ہر جھٹکے کے ساتھ ارملا کا ذہنی توازن متزلزل ہو رہا ہے۔ اور ارملا کی گرفت اس کے بازوے گرد سخت۔ رفتہ رفتہ ارملا کی مخمور نگاہیں نیم وا ہوتے ہوتے بالکل مدہوش ہوگئیں۔ اور اس نے آنکھیں موند کر اپنا بایاں رخسار سرندر کے دائیں رخسار سے پیوست کر دیا۔ سرندر شدّتِ جذبات سے کانپ اٹھا۔ اس نے ایک بار پوری شدّت سے ارملا کو اپنے جسم سے لپٹا لیا۔ پھر اس کے سر اور رانوں کے گرد ہاتھ ڈال کر اس کے نرم ملائم لچکیلے جسم کو اپنی گود میں لے لیا۔ اور اسی انداز سے پلنگ پر نیم بیٹھے نیم لیٹے اس نے اپنے لب ارملا کے لبوں سے ملا دیئے۔ ایک طول طویل بوسہ سرندر نے محسوس کیا۔ جیسے اس کی روح تحلیل ہو کر ارملا کے جسم میں داخل ہو جانا چاہتی ہے۔ جیسے وہ خوابوں کی ایک حسین اور شیریں دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ جیسے وہ شہد کے لمبے لمبے گھونٹ بھر رہا ہے۔ ارملا کے دونوں ہاتھ سرندر کے بازوؤں سے نکل کر شانوں پر پھیلے ہوئے تھے اس نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے اس کے سر کی پشت پر پہنچ گئے ہیں اس نے اپنے لبوں کا بار ارملا کے لبوں پر اور بھی سخت کر دیا۔ پھر اس کے لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اور اس نے ارملا کے نچلے ہونٹ کو اپنے لبوں میں لیکر زور سے دبایا۔ ارملا کے سینے میں میٹھی میٹھی گدگدی سی ہوئی۔ اس نے ایک بار جی بھر کر سرندر کے چہرہ کی جانب دیکھا۔ پھر زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ سرندر نے بڑھ کر ان مخمور آنکھوں کا بوسہ لے لیا۔ اور پھر پیشانی کا۔ اُس کے ساتھ ہی ارملا کے ماتھے کی بندی خنجر کی طرح اس کے سینے میں چبھی۔ اس کے بڑھتے ہوئے لب وہیں رُک گئے۔ اس کے سینہ سے ایک ٹیس سی اٹھی۔ اور اس کے عضو عضو کو لرزاتی ہوئی نابود ہوگئی اُسے اپنی جسارت پر پریشانی سی محسوس ہوئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس نے دیدہ دانستہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماروی ہے۔ اُسے ارملا کے ماتھے کی بندی کے پس پردہ اپنی اُمیدوں کا جنازہ نظر آیا۔ اس کے سینہ سے رنج و غم کا ایک طوفان اُٹھا۔ اور اس کی آنکھیں آنسوؤں

سے لبریز ہوگئیں۔

لیکن ارملا اس کے اس ذہنی زلزلہ سے نا آشنا اس سے لپٹی جا رہی تھی۔ معاً آتشِ سیال کا ایک قطرہ اس کے چہرہ پر گرا۔ پھر ایک اور —— ارملا نے تلملا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا سرندر کی ایک لمحہ پہلے نشۂ محبت سے مخمور آنکھیں اب خون بہا رہی ہیں۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ اُسے یوں محسوس ہُوا کہ یہ پگھلا ہوا لاوا اس کے رخساروں کو چیرتا ہوا اس کے سینہ میں اُتر جائیگا۔ اور اس کی آرزوؤں کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ اس نے تلملا کر دونوں ہاتھوں سے سرندر کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا۔ سرندر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اور ارملا کے درمیان ایک ناقابلِ شکست دیوار حائل ہوگئی ہے۔ تصوّر کے عظیم الشان قصر کی دیواریں لرزیں۔ آرزوؤں کا سحر ٹوٹا۔ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ اور ارملا کو آہستہ سے بازوؤں میں اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ اور خود جھک کر نیچے اُتر گیا۔

چند لمحہ ارملا پھٹی پھٹی نظروں سے سرندر کے چہرہ کی جانب دیکھا کی۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا۔ کہ ایک لمحہ پہلے وہ جس حسین دُنیا میں تھی۔ وہ اس قدر بودی اور ناپائیدار ثابت ہوگی۔ کہ چند اشکوں کی نمی اُسے ملیا میٹ کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ یا کیا وہ محض ایک خواب تھا۔ ایک حسین خواب جس سے وہ ابھی ابھی چونک کر بیدار ہوگئی تھی لیکن نہیں وہ خواب نہیں تھا۔ اس کی لذت تو ابھی تک اس کے عضو عضو کو برما رہی تھی پھر آہستہ آہستہ اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ سرندر کے چہرہ پر پھیلتی ہوئی پشیمانی نے اُسے عرقِ ندامت میں غرق کر دیا۔ اس کی پیشانی پھوٹ بہی اس نے آنچل سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ اور سر کو اور بھی جھکا لیا۔

چند لمحہ کے لئے کمرہ میں سکوت رہا۔ موت سے ہیبتناک سکوت۔ پھر ارملا

نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

کیا میں جا سکتی ہوں؟"

اور سرندر کوئی جواب دئے بغیر چپکے سے اُسے نیچے پہنچانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ موٹر میں بیٹھتے ہوئے ارملا نے ایک بار پھر سرندر کے چہرہ کی جانب دیکھا۔ اب تک ایک حسرت ناک سکون اس کے چہرہ سے ہویدا تھا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ آنکھوں نے کچھ کہا بھی لیکن لب خاموش رہے۔ اور موٹر اسٹارٹ ہو گئی۔

سرندر جب واپس اپنے کمرہ میں پہنچا۔ تو اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ دن بھر کے واقعات اس تیزی سے اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ جیسے کسی سلنٹ فلم کی بے ترتیب ریلیں۔ اور ان سے وہی پریشانی و بے ربطگی ہویدا تھی۔ جو ایک اُجڑی ہوئی محفل سے۔ اس نے خیال کیا۔ آج صبح وہ کس قدر مطمئن اور پریشان تھا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنی زندگی وبال نظر آ رہی تھی۔ پھر یکایکی اس کی زندگی میں خوشیوں کا فوّارہ پھوٹ نکلا۔ لیکن اُمنگیں ابھی گہوارۂ اُلفت میں اپنی خوش نصیبی پر مچل ہی رہی تھیں۔ کہ ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اور ان کی آرزومندانہ جنبش شمع کی آخری بھبک ثابت ہوئی۔ اور وہ اُمنگیں اپنی بے بسی کا نوحہ پیٹ کر خاموش ہو گئیں۔ خاموش اے کاش کہ خاموش ہو جاتیں لیکن وہ تو جاتی جاتی بھی اس کے سینہ کو حسرت، قلق، رنج، الم، تڑپ، بے چینی اور بے کلی سے معمور کر گئیں۔ ایک دل میں یہ آفتوں کا طوفان۔ ایک دل میں یہ حسرتوں کی فراوانی وہ حیران تھا کہ وہ ایک حساس دل کو کن کن آفتوں کے مقابلے کے لئے سینہ سپر کرے گا۔ ایک شیشہ کو کس کس پتھر سے ٹکرائے گا۔ اور دفعتاً اُسے جگر کا وہ شعر یاد آیا ؎

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اور اُسے یوں محسوس ہوا۔ کہ اس کا دِل گوشت پوست کے لوتھڑے کی بجائے محض ایک سُرخ بلور کا ٹکڑا ہے۔ اور وہ شیشہ دِل کو ہاتھ میں لئے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا رہا ہے۔ ٹک ٹک ٹک۔ ٹک ٹک کھٹ۔ کھٹ کھٹ کھٹ وہ جیسے چونک اُٹھا کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر سنبھلتے ہوئے کہا۔

"اندر آجاؤ"

آہستہ آہستہ دروازہ کھلا اور شوکت نے اندر قدم رکھا۔

"تم شوکت!" سرندر نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے میں شوکت کا بھی حصّہ ہے۔ اُسے شوکت کا آنا اس درجہ ناگوار گزرا۔ کہ اس نے خشک لہجہ میں پوچھا۔

"کیسے آئے"

"آپا پوچھتی ہیں۔ آپ کل کیوں نہیں سے"

"نہیں آسکا"

"آج سینما دیکھنے چلیں گے"

"نہیں"

کیوں"

"بس کہہ جو دیا —— اب جاؤ —— میرا دماغ مت چاٹو"

اور بیچارا شوکت سرندر کی تلخی کا مدعا نہ سمجھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے ہکّا بکّا سرندر کے چہرہ کی جانب دیکھا کیا پھر حیران و پریشان آہستہ آہستہ سر جھکائے سیڑھیوں سے اُتر گیا۔

شوکت کے جاتے ہی سرندر کا سر ایک بار زور سے چکرایا۔ اُسے محسوس ہوا۔ کہ شوکت جاتے جاتے اس کی اُمیدوں کی شمع کو گُل کرتا گیا ہے اسے ابھی

نگاہوں کے آگے تاریکی چھاتی محسوس ہوئی۔ اور وہ سر تھام کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

سرندر اور ارملا کئی بار پھر آپس میں ملے لیکن جیسے وہ گزشتہ ایام کو مطلقاً فراموش کر چکے تھے۔ وہ آپس میں ہنستے تھے کھیلتے تھے۔ کلبوں اور رسٹورنٹوں میں جاتے تھے بے باکی سے ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈال کر چلتے تھے لیکن شاید وہ برقی تار منقطع ہو چکے تھے۔ جن کے مس ہی سے دونوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگتے تھے۔

ارملا کی سابقہ الفت جب یوں سرندر کی زندگی میں خواب و افسانہ بن گئی تو سرندر نے چاہا۔ کہ ایک بار پھر ناہید سے تعلقات استوار کرے لیکن شاید وہ حسن کی برہمی کا مدعا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی ناکام رہی۔ اور ناہید نے اس کی پھینکی ہوئی جاکلیٹوں کو اٹھا کر گلی میں پھینک دیا۔ ہاں موقعہ پا کر ایک دن سرندر نے دل کی تسلی کے لئے ناہید کی ناآگہی میں ہی اپنے کوٹھے کی چھت سے اس کا فوٹو اتار لیا۔

نور و نار

یہ ایک عورت کے دھڑکتے ہوئے دل کی داستان الفت ہے جس نے محبت اور فرض کی کشمکش میں نسوانی پاکیزگی کو نباہی کی منزل تک پہنچانے میں گریز نہ کیا۔ دوسرا ایڈیشن

قیمت مجلد کتاب صرف عہ

مصنفہ پرویز

ساتواں باب

امتحان دیتے ہی سرندر راولپنڈی چلا آیا۔ اور راولپنڈی آتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شکنتلا نے کئی بار اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اور سرندر نے بھی ان نظروں کا پُر محبت انداز میں جواب دیا۔ لیکن شاید سرندر کی شادی کے خیال ہی نے شکنتلا کو کھل کھیلنے کا حوصلہ نہ دیا۔ اور وہ دبی دبی گھٹی گھٹی سی رہنے لگی ہے۔ اس کی نظروں میں ایک تڑپ تھی۔ ایک خوفزدہ پرندہ کی طرح۔ اس کی آنکھیں محبت کی پھران ہی دلفریب گھاٹیوں میں پرواز کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ایک پرشکستہ پرندہ کی طرح اُن سے طاقت پرواز چھن چکی تھی

پھر گھر میں مہمان آنے شروع ہوئے۔ اور یہ حسرت بھری نظروں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ سرندر یوں بھی ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ اور دولہا کی حیثیت نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ اور ہر ایک مہمان یہی چاہتا تھا۔ کہ اس مقناطیس سے چمٹ کر رہے۔ اور اسی محور کے گرد گھومے۔ اور ان ہی مہمانوں میں ایک تھی سمترا۔

ایک چودہ سالہ ناکتخدا لڑکی جس نے ابھی شباب کی دلفریب وادی میں قدم رکھا ہی تھا۔ اور شاید سب سے زیادہ سرندر کی متفناطیسی طاقت کا اس پہ اثر ہوا تھا۔ کیونکہ جب کبھی وہ سرندر کو تنہائی میں پاتی۔ وہ اس سے لپٹنے کے لئے بیتاب نظر آتی۔

"آپ کو تو کسی کی پرواہ ہی نہیں" ایک روز تنہائی میں اس نے شکایت کے انداز میں کہا۔

"میری بھی کوئی پرواہ کرتا ہے؟" سرندر نے اسی انداز میں استفسار کیا۔

"آپ سے کون پیار نہ کرتا ہوگا" سمرنے ایک عجیب دلبرانہ انداز میں کہا۔ پھر دونوں ہاتھ ملاکر سرندر کے کاندھے پر رکھ دئے۔

"آپ کرتی ہیں" سرندر نے شوخی سے پوچھا۔

"میں تو ہروقت آپ کا نام سمرتی ہوں" سمرنا نے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"تمہارا تو کام ہی سمرنا ہے" سرندر نے سمرنا کی ٹھوڑی اونچی کرکے اس کی نگاہوں سے نگاہیں ملاتے ہوئے کہا۔

سمرنا نے محجوب نظروں سے سرندر کی جانب دیکھا لیکن بجائے اس کے کہ سرندر سمرنا کو کھینچ کر سینہ سے لپٹا لیا۔ اس نے سوخی سے اس کے رخساروں پر چٹکی لی۔ اور پھر تیزی سے کمرہ سے باہر چلا گیا۔ سمرنا ایک لمحہ کے لئے حیرت سے جاتے ہوئے سرندر کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہ سرندر کے یوں ایکا ایکی چلے جانے کا راز سمجھ گئی۔

مہمان بڑھتے گئے اور سمرنا کو تنہائی میں سرندر سے شکوہ شکایت کرنے موقعے کم ملنے لگے تاہم وہ جب کبھی سرندر کو تنہا پاتی کوئی نہ کوئی چھیڑ ضرور کرتی۔ اور سرندر ننت نئی چوٹیں سہتے سہتے شادی کی تیاریاں کرتا رہا۔

شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ دینے والوں نے جی کھول کر دیا

اور لینے والوں نے ہاتھ بڑھا بڑھا کر لیا۔ لیکن جب شبِ عروسی نے دلہن کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ تو سرندر کے دل کی آرزوئیں دل ہی دل میں کراہ کر رہ گئیں۔ دلہن۔ اگر بدصورت نہ تھی تو اُسے کسی حالت میں قبول صورت نہ کہا جا سکتا تھا

سرندر کو یوں محسوس ہوا۔ کہ دلہن کی صورت میں یہ قدرت کا انتقام ہے۔ اس کے اعمال کا تازیانہ۔ اس کی حسرتوں کا مزار وہ اپنی آرزوؤں کا جسے اس نے آرٹ اور حسن کے پرتو سے جگمگا رکھا تھا۔ یہ حسرت ناک حال دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اسے اپنا دل سینہ میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے یوں محسوس ہو کہ یہ ان معصوم دلوں کا سراپ ہے جن کے ساتھ وہ بے نیازی سے کھیلا کیا۔ اور کبھی یہ خیال تک نہ کیا۔ کہ یہ نازک کھلونے اگر ٹوٹ گئے تو کیا ہو گا۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ اسے ان کے ٹوٹ جانے میں مزا آتا تھا۔ اب اگر قدرت نے خود اس کا دل توڑ دیا۔ وہ مچلتا ہوا خود سرول تو اس میں کسی کا کیا قصور تھا۔ دلہن کا کیا قصور تھا۔ اس نے تو پرماتما سے یہ نہ کہا تھا۔ کہ اسے قبول صورت۔ بنایا جائے۔ اس نے ایک حسرت ناک کروٹ لی۔ اور خاموشی سے لیٹ گیا۔

دوسرے دن اس ناخوشگوار بوجھ کو واپس اس کے میکے پہنچانا بھی سماج کا عائد کردہ سرندر کا ایک ناگوار فرض تھا لیکن سسرال پہنچتے ہی سب سے پہلے جس نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ ایک پانزدہ سالہ برق مجسم دوشیزہ تھی۔ صانع ازل کا حسین ترین شاہکار، بہزاد قدرت کا آخری نقش۔ اور ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کائنات کے تمام حسن نے کیونکر ان دلفریب آنکھوں اور ان پتلے پتلے ہونٹوں میں نمو پائی۔ کہ وہ نازک لب ہلے۔ اور ایک شیریں صدا سنائی دی۔

"سرندر جی نمستے"

وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ کہ آواز میں، صرف آواز میں شہد کی سی مٹھاس کیونکر کیسی

لرزش مقناطیس کی سی کشش سب کی سب یکجا کیونکر ہو گئیں۔ اس نے بوکھلا کر ان دلفریب لبوں کی جانب دیکھا۔ لیکن پیشتر اس کے وہ کچھ کہے۔ پتلی پتلی پنکھڑیاں پھڑکیں ہوا میں ایک لرزش پیدا ہوئی۔ اور سرندر نے محسوس کیا۔ کہ کوئی کہہ رہا ہے۔

"ہم سے نہیں بولیں گے آپ کیا؟"

سرندر نے کچھ جواب ضرور دیا ——— کیا؟ ——— یہ تو اُسے ایک لمحہ بعد یاد نہ تھا۔ اور نہ ہی انتہائی کوشش کے باوجود وہ آج تک یاد کر سکا۔

. . . .

چند تو یہ تسکین راتیں جن میں سرندر ایک یاسمینی شباب کی نزہت سے مخمور رہا۔ رات گئے تک وہ دلنواز حسینہ سرندر سے باتیں کیا کرتی۔ ایسی باتیں جن کی ابتدا نامعلوم کیسے ہو جاتی۔ اور انتہا خدا جانے کیسے ہوتی۔ لیکن وہ باتیں کیا کرتے۔ پلنگ پر کہنیاں ٹیکے ہوئے۔ کرسی پر آگے کو جھکے ہوئے۔ تکیہ کو بازوؤں کے نیچے رکھے ہوئے۔ ٹھوڑی کو ہاتھ کا سہارا دیئے ہوئے۔ غرض وہ باتیں کرتے جاتے، کرتے جاتے وہ بے مدعا باتیں جو صرف کی جاتی ہیں سمجھی نہیں جاتیں۔ حتیٰ کہ رات گہری ہو جاتی۔ ومنتی انگڑائی لے کر اٹھتی۔ سرندر اُسے ٹھہرنے پر مجبور کرتا۔ وہ چند لمحوں کے لئے رک جاتی۔ پھر اٹھتی اور مخمور نظروں سے سرندر کی جانب دیکھتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی جاتی۔ اور سرندر پلٹ کر اپنی رفیقۂ حیات کی جانب دیکھتا۔ جو قریب ہی پلنگ پر لیٹی بے ہنگم خراٹوں سے فضا کو مسموم بنا رہی ہوتی۔ وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔ اور چپکے سے پلنگ پر لیٹ جاتا۔

دن گزرتے گئے اور سرندر کے دل کی دھڑکنیں ومنتی کے پاؤں کی چاپ کے ساتھ بڑھنے گھٹنے لگیں۔ وہ آتی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ جاتی تو اُسے اپنا دل سینہ میں ڈوبتا محسوس ہوتا۔ لیکن جب تک وہ اس کے پاس بیٹھی رہتی وہ دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکن میں بھی سکون محسوس کرتا۔ ان سب باتوں کے باوجود

وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کہ جو جذبہ اس کے دل میں دمنتی کے لئے پرورش پا رہا ہے دمنتی کے دل پر اس نے کہاں تک اثر کیا ہے۔ دمنتی اس سے نہایت خلوص سے پیش آتی تھی۔ اس کی ادنےٰ سے ادنےٰ ضروریات کا خیال رکھتی تھی لیکن اس کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہے۔ وہ حیران تھا کہ اگر محبت کے دیوتا نے دمنتی کے دل کو اپنے تیروں سے نہیں چھیدا تو اس کی یہ وقت بے وقت کی خاطر داریاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ اور اگر اس کا اُنس محض اس اُنس تک محدود ہے۔ جو بہنیں دولہا کے لئے عموماً دکھائی دیتی ہے۔ تو وہ رات گئے تک کیوں باتوں سے اس کا دل بہلاتی ہے خصوصاً وہ کیوں۔ گھر میں اور بھی تو لڑکیاں موجود ہیں۔ وہ کیوں نہیں اس کی آسائشوں کا خیال کرتیں۔ اس کی خاطر داری کی طرف دھیان دیتیں۔ اور اُسے وہ واقعہ یاد آیا جب وہ اس کا سالا کھانا کھا رہے تھے۔ دمنتی دو فرنی کی پلیٹیں لائی۔ اُن میں سے ایک چھوٹی تھی اور ایک بڑی۔ بدقسمتی سے جس جانب سرندر بیٹھا ہوا تھا۔ اس ہاتھ کی پلیٹ چھوٹی تھی۔ دمنتی قریب پہنچ کر ایک لمحہ کے لئے ہچکچائی۔ پھر اس نے پھرتی سے بازوں کو قینچی کی صورت میں کاٹ کر بڑی پلیٹ سرندر کے سامنے اور چھوٹی اس کے سالے کے سامنے رکھ دی۔ کہ سرندر اس کی پھرتی پر عش عش کر اُٹھا۔ اس کے دل میں خوشی کی ایک ترنگ اُٹھی۔ اور اگر اس کے بس میں ہوتا وہ بڑھ کر اُن نرم نرم بلوریں انگلیوں کو بوسہ دیتا لیکن انتہائی یگانگت کے باوجود سرندر کو کبھی اس بات کا حوصلہ نہ ہوا۔ کہ وہ دمنتی کے ساتھ بیباکی سے پیش آئے۔ شاید وہ حُسنِ پُرشکوہ ایک ایسی عظمت اور پاکیزگی کا آئینہ دار تھا۔ کہ اس کو چھونے کے خیال سے ہی اس کا دل کانپ کانپ اُٹھتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی۔ کہ از کم اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیکر ایک آدھ بار دبا ہی دے لیکن جہاں اس کی سرکتی ہوئی انگلیاں دمنتی کی انگلیوں سے چھوئیں۔ اس نے خود گھبرا کر انگلیاں کھینچ لیں۔

دمنتی ایک دو بار اس کی اس حرکت پر مسکرائی تھی لیکن وہ مسکراہٹ کچھ اس قدر پُراسرار تھی کہ وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکا۔ کہ اس کے لئے دعوتِ عمل ہے۔ یا اس کی لغزشوں پر ایک عفو آمیز طنز اور پھر اکہا اکی گھر سے یکے بعد دیگرے دو تین چٹھیاں آئیں۔ اور اُسے مجبوراً واپس لوٹنا پڑا۔ جانے سے پہلے تقدیر نے انہیں ایک بار تنہا میں دیا۔ دونوں نے نظر بھر کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پھر دمنتی نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

"آپ تو جاتے ہی ہمیں بھول جائیں گے۔"

"تمہیں دمنتی۔ تمہیں کیا میں بھول سکتا ہوں۔"

"آپ کا کیا ہے"

"کیوں"

"اتنے دن آپ ...." اور دمنتی کہتے کہتے رُک گئی

"ہاں ہاں کہہ دو نہ اب"

"اچھا جانے دیجئے۔" دمنتی نے ایک گہری آہ لیتے ہوئے کہا۔

"اب بات کو مکمل کر دو دمنتی" سرندر نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

لیکن دمنتی ایک دفعہ رُک جانے کے بعد پھر نہ کھل سکی۔ اور سرندر کی سب التجائیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ دمنتی نے ایک بار رنجیدہ نظروں سے سرندر کی جانب دیکھا اور صرف اتنا کہا۔

"دیکھو سرندر مجھے مجبور نہ کرو۔"

اور سرندر اس پُر شکوہ حُسن کی یہ ملتجی نظریں برداشت نہ کر سکا۔ اس سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ کہ ہمالہ کی چوٹیاں سرنگوں ہو کر پا بوسِ زمین ہو جائیں اُسے یہ حُسن کی توہین نظر آئی۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے دمنتی کے چہرہ کی جانب دیکھا اور خاموشی سے کمرہ سے باہر چلا گیا۔

کتنے ہی ماہ گزر گئے اور سرندر ازدواجی زندگی کی تلخیوں سے آشنا ہوتا گیا۔ ادھر ازدواجی زندگی کی تلخیاں۔ ادھر ملازمت کی سرگرانی۔ اور وہ سرندر جس کی قابلیت کبھی مسلمہ تھی۔ ہر روز صبح سے شام تک دفتروں کی خاک چھاننے کے باوجود کوئی اچھی ملازمت حاصل نہ کر سکا۔ تھک ہار کر اس نے چالیس روپیہ ماہوار کی کلرکی قبول کر لی۔ وہ سرندر جو کبھی چالیس روپیہ ماہوار کرایہ کے مکان میں رہنا اپنی شایانِ شان نہ سمجھتا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی نے اُسے چالیس روپیہ کا کلرک بنا دیا۔ اور وہ بھی راولپنڈی سے بہت دُور قلعہ شیخوپورہ میں۔ وہ جب اپنے گذشتہ ایام کا تصور کرتا۔ تو اس کے دل سے ایک ہوک سی اُٹھتی۔ اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا۔ پھر ان تاریک دنوں میں اگر دمنتی کی یاد آجاتی۔ تو یہ چنگاری سلگ کر اس کی تاریک زندگی کو اور بھی تیرہ و تار کر دیتی۔

دن گزرتے گئے اور دمنتی کی یاد سرندر کے سینہ میں ایک دائمی خلش بنتی گئی لیکن گردشِ روزگار نے اِس طول طویل عرصہ میں اس جذبہ کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا۔ پھر اچانک ایک روز اُسے ملکوال سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ کسی کملا کی شادی تھی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ کملا اس کی رفیقۂ حیات کی کسی دُور کے رشتہ میں بہن ہے اور مُنہ بولی سہیلی بھی۔ سرندر دفتری زندگی سے اکتا ہوا تھا۔ اس نے جھٹ ایک ہفتہ کی رخصت کے لئے درخواست دے دی۔ اور خوش قسمتی سے وہ منظور بھی ہو گئی۔

دوسرے دن دوپہر کی گاڑی سے وہ اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ ملکوال چل دیا۔ راستہ میں لالہ موسیٰ سٹیشن پر گاڑی تبدیل کی گئی۔ اور پھر یہاں قدرت نے ایک کروٹ لی۔ انٹر کلاس کے جس زنانہ ڈبہ میں اُس نے اپنی رفیقۂ حیات کو بٹھایا۔ اسی میں سمرنا بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دل سینہ میں زور زور سے دھڑکے اور سرندر نے محسوس کیا۔ کہ یہ دل دھڑک دھڑک کر سب راز فاش کر دیں گے۔ اس نے جلدی سے سمرنا کو نمستے کہا۔ اور اس کی پیاسی نظروں کی تاب نہ لا کر دوسرے

کمرے میں چلا گیا۔

سمرنا بھی کملا کی شادی پر ملکوال جا رہی تھی۔ نو بجے شب کے قریب وہ ملکوال پہنچے سفر کی تھکاوٹ کے باعث سرندر نے اس وقت یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی اس کے رشتہ داروں میں سے کون کون آئے ہوئے ہیں۔ اس نے کھانا کھایا اور لباس تبدیل کر کے سونے کے لئے چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے اور اس کی رفیقۂ حیات کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ اس لئے اُسے کمرے کی تنہائی بے حد پسند آئی۔ اس کی رفیقۂ حیات کھانا کھانے کے بعد عورتوں کے مجمع میں شامل ہو گئی تھی۔ جو بیٹھی ڈھولک پیٹ رہی تھیں۔ اور اُسے معلوم تھا۔ کہ رات گئے تک یہ عورتیں ڈھولک پیٹتی رہیں گی۔ اور فرسودہ گانے گاتی رہیں گی۔ جو شاید مہا بھارت کے زمانہ کی یادگار رکھتے گو گذشتہ کچھ عرصہ سے کبھی کبھی ڈھولک پر ماہیا بھی اُڑنے لگا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس اُمید موہوم پر اپنی نیند خراب نہ کرنا چاہتا تھا۔

سردیوں کے دن تھے۔ اس نے سب کھڑکیاں بند کر دیں۔ اور پردے پھیلا دئے وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سردی کو روکنے کے ساتھ ساتھ یہ بند کھڑکیاں اس ڈھولک اور گانے کی آواز کو بھی اس سے دور ہی رکھیں۔ اس نے دروازہ بھی بھیڑ دیا۔ اُس کا بس ہوتا تو دروازے کی چٹخنی بھی چڑھا دیتا۔ لیکن اُسے معلوم تھا۔ کہ ایک دو بجے کے قریب اس کی رفیقۂ حیات دھپ دھپاتی ہوئی آئے گی۔ اور اگر دروازہ بند ہوا تو وہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر زمین آسمان سر پر اُٹھائے گی۔ اور وہ نہ چاہتا تھا۔ کہ آدھی رات کے وقت اس کی نیند پر یہ ستم ٹوٹے جائیں۔

وہ ابھی نیند اور ہوش کی درمیانی حالت میں تھا۔ کہ اُسے اپنے بستر میں کچھ

سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ پھر کسی نے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد ڈال دئے اور بڑھ کر اس کے لبوں کا بوسہ لے لیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور سمرنا کو اپنے پہلو میں لیٹا دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"تم ——— سمرنا" ——— سرندر نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"جی ——— سمرنا نے مسکراتے ہوئے کہا" مجھے ذرا سردی لگ رہی تھی۔ اور انگیٹھی کمرے میں صرف ایک ہی تھی جس کے گرد سب عورتیں بیٹھی ڈھولک بجا رہی تھیں اس لئے میں چپکے سے تمہارے پاس چلی آئی" کہتے کہتے سمرنا نے فنوخی سے اپنا بایاں بازو سرندر کے کمر کے نیچے سے ڈال کر اسے زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"اور اگر کوئی آگیا تو ؟"

"میں نے چٹخنی لگا دی ہے" سمرنا نے اسی مسرور انداز میں جواب دیا۔

"اس دروازہ کو ؟"

"جی اس کو بھی"

اور جب سرندر نے محسوس کیا کہ وہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم بڑی شوخ ہو"

"جی" سمرنا نے ناز سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اور سرندر کو سمرنا کی یہ ادا کچھ ایسی بھائی۔ کہ اس نے بڑھ کر سمرنا کے لبوں سے اپنے لب لگا دیئے۔ اور کتنی ہی دیر ان تپتے تپتے لبوں کا رس چوستا رہا۔ سمرنا نے بھی سرندر کی جسارت کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو گدگدانے لگے۔ گدگدانے گدگداتے سمرنا کے ثمر حیاتی سرندر کے ہاتھ آگئے۔ سرندر نے ایک دفعہ انہیں مضبوطی سے پکڑ کر مسلا۔ دوسرے

ہی لمحہ وہ گوشت پوست کے ٹکڑے چٹان کی طرح سخت ہو گئے۔ سرندر نے محسوس کیا۔ یہ ہے جوانی جس میں پھول سی ملائمت بھی ہے۔ اور چٹان کی طرح سختی بھی اور اس نے خیال کیا۔ شاید اسی آہنی مضبوطی کے باعث عورتیں جب کسی سے محبت کرتی ہیں۔ تو دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں اپنے محبوب کے پاس پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔ اسی سمرنا کو لو۔ بیسیوں عورتوں کے جھرمٹ سے یہ کس طرح دامن بچا کر نکلی ہو گی۔ اور پھر اپنی ناموس کو خطرہ میں ڈال کر کس بے دریغی سے اس کا پہلو گرمانے پہنچ گئی۔ اور سمرنا کے اس ایثار کا تصور کرتے ہی اس کا سینہ محبت کے جذبات سے لبریز ہو اٹھا۔ اس نے سمرنا کے لبوں کو دوبارہ ایک پُراشتیاق بوسہ دیا۔ اور اُسے سینہ سے چمٹا کر زور سے بھینچا اور کتنی ہی دیر اسی طرح بھینچے رہا۔ حتیٰ کہ کسی کے پاؤں کی چاپ نے ایک لخت ان کے قلوب میں بجلی کی ہنستی لہریں پیدا کر دیں۔ اور وہ گھبرا کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

دوسرے ہی لمحہ وہ چاپ ان کے دروازہ سے گزر کر سرسراتی ہوئی سیڑھیوں میں نابود ہو گئی۔ اور وہ مسکرا کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ چند ہی لمحہ بعد پھر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی لیکن اس دفعہ وہ بڑھتے ہوئے پاؤں ان کے دروازہ کے قریب آ کر رک گئے۔ کسی نے آہستہ سے دروازہ تھپ تھپایا۔

"کون" سرندر نے مخمورانہ انداز میں پوچھا۔

"میں ہوں" سرندر کی رفیقۂ حیات نے جواب دیا۔

"آ ہا ____" اور کہتے کہتے سرندر نے سمرنا کو بازوؤں میں اٹھا کر دوسرے دروازے کے قریب کھڑا کر دیا۔ اور آنکھ سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر خود اپنی رفیقۂ حیات کو دروازہ کھولنے بڑھا اور دونوں ہاتھ بیک وقت میں اتریں، لیکن پیشتر اس کے کہ سرندر اپنی رفیقۂ حیات کو کواڑ کھولتا۔ اس نے نگاہیں گھما کر اطمینان کر لیا۔ کہ سمرنا

جا چکی ہے۔

دوسرے دن صبح جب سرندر بیدار ہوا۔ تو اس نے اپنی چارپائی پر ایک ہیئرپن پایا۔ اس نے جھٹ وہ ہیئرپن اٹھا کر پاکٹ میں ڈال لیا۔ اور خیال کرنے لگا۔ اگر اس کی رفیقۂ حیات سمرنا کے ہیئرپن کو دیکھ لیتی تو اسے اپنی صفائی پیش کرنا مشکل ہو جاتی۔

دس بجے کے قریب سرندر کی رفیقۂ حیات نے اس کی کملا سے ملاقات کرا دی ایک پتلی سی گلاب کی ٹہنی سرخ دوپٹہ میں لپٹی کمرہ کے ایک تاریک گوشہ میں دری پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک پیڑھی پر پانی کے دو گھڑے بھرے رکھے تھے جن کے منہ سے گرد سرخ تاگے (مولی) لپیٹے گئے تھے۔ اور جن کے اوپر ایک ایک چار مکھیہ (چار منہ والا) مٹی کا دیا روشن تھا۔ اور ان آٹھ لوؤں کی ساکن لو اس نو شگفتہ گلاب کے نظر فریب چہرہ کو ایک تاباں جگمگاہٹ سے معمور کر رہی تھی۔ سرندر حسن کے اس دلفریب مجسمہ کو اس رومان انگیز ماحول میں دیکھ کر کانپ اٹھا کہ اسے یوں محسوس ہوا کہ کملا کے لباس میں کوئی پھولوں کی پری ان خاموش شمعوں کی آتشیں روشنی میں نور نہا رہی ہے۔ شاید قدرت اس ہلکے گلابی چہرہ کو اور بھی تاباں بنانے کے لئے ان شمعوں کی تابانی کو مستعار لیکر اس کے چہرے میں حلول کر رہی ہے۔ اور حسن اور شمع۔ اور اس نے خیال کیا۔ کیا اس سے بہتر امتزاج کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ یہ شاعر لوگ آج تک شمع اور حسن کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن کاش کہ ان میں سے کوئی ان دونوں کو یکجا کر کے دیکھتا۔ پھر دیکھتا کہ کیا گیا گل اور اسے شک گزرا کہیں یہ کملا گلاب کا پھول تو نہیں لیکن نہیں اس سرخ و سپید چہرہ کے نیچے یہ پتلا سا لانبا سا ملائم جسم یہ تو سچ مچ ایک دلفریب ٹہنی پر کمل کا پھول کھل رہا ہے۔

"نمستے جی" کملا نے اپنی باریک آواز میں کہا۔ اور سرندر نے بوکھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"جی نمستے" اور پھر خود کی قریب ہی دری پر بیٹھ گیا۔ اور اس کے قریب ہی اس کی رفیقۂ حیات بھی۔ کمرہ میں چند ایک اور بھی لڑکیاں موجود تھیں۔ لیکن وہ سب اپنی اپنی کھچڑی علیحدہ علیحدہ پکا رہی تھیں۔

"آپ کی شادی پر میں نہ پہنچ سکی۔ اس کا مجھے آج تک افسوس رہا ہے"۔ کملا نے چہرہ پر ہلکی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تو آپ مسکرا مسکرا کر اتنا عرصہ افسوس ہی کرتی رہیں" سرندر نے طنز سے کہا:

"مسکراہٹ تو آپ کے دیکھنے سے لبوں پر آ گئی" کملا نے سادگی سے کہا۔

"جی۔ ہم آدمی نہ ہوئے کارٹون ہوئے"

اور باوجود ضبط کے کملا اپنی ہنسی روک نہ سکی۔ ایک ہی لمحہ بعد اس نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا کہ آ گئے"

"جی ہاں۔ ہم نے بہت غلطی کی کہ ایک خط پر کھنچے چلے آئے۔

"غلطی کیسے"؟

"آپ اپنی بہن کی شادی پر کیوں نہ آئی تھیں؟"

"ماتا جی بیمار تھیں۔ ورنہ میں ہر صورت آپ کے درشنوں کو پہنچ جاتی"۔

"ہمارے درشنوں کی بھی ایک ہی رہی۔ آپ اپنی بہن کی خاطر ہی آ جاتیں"۔

"بہن تو ہر وقت میرے دل میں بستی ہے" کہتے کہتے کملا نے اپنے دونوں بازو سرندر کی رفیقۂ حیات کی گردن کے گرد ڈال دیئے۔

"جی ہاں۔ ہم ہی دل سے دور ہیں" سرندر نے عجیب انداز سے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ تو آتے ہی دل میں کُھب گئے۔"

"اکاس بیل کی طرح۔"

"اب باتوں میں آپ سے کون جیتے گا۔" کملا نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"ہم کو جیتنے کی کیا ضرورت ہے۔" سرندر نے شوخی سے کہا۔ "اب سسرال جا کر کسی کا دل جیتنے گا۔"

لیکن جب اس نے اپنے اس چُبھتے ہوئے فقرے کے تاثرات دیکھنے کے لئے نگاہیں کملا کے چہرے پر ڈالیں۔ تو وہ دھک سے رہ گیا۔ وہ سُرخ و سپید چہرہ جو ایک لمحہ پہلے آتش بلاؤں کی تابانی سے جگمگا رہا تھا۔ خوفناک حد تک زرد ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ ایکا ایکی اس مسکراتے ہوئے چہرے پر زردی کیوں چھانے لگی۔ وہ کونسا زہریلا بان اس کے الفاظ میں پوشیدہ تھا جس نے جاتے ہی اس شگفتہ کلی کا کلیجہ مسوس کر رکھ دیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ سمجھتا۔ کملا نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ اور سرندر کی رفیقہ حیات کے شانے سے لگا دیا۔

"میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی جو آپ کو شاق گزری ہو۔" سرندر نے ہراساں ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔" کملا نے پژمردہ لہجہ میں جواب دیا۔ "میری تقدیر ہی ایسی تھی۔"

لیکن اس سے پیشتر کہ سرندر کچھ اور پوچھتا۔ اس کی رفیقہ حیات نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحہ کچھ بے ربط سی باتیں ہوئیں۔ لیکن اب سرندر کو ایک ایک لمحہ وہاں بسر کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اپنے کمرہ میں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلا سوال اپنی رفیقہ حیات سے یہ کیا۔

"یہ کملا ایکا ایکی یوں پژمردہ کیوں ہو گئی؟"

"جس لڑکے سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ کچھ قبول صورت نہیں۔"

اور سریندر کو اپنی آنکھوں کے آگے سے ایک پردہ سا ہٹتا محسوس ہوا۔ اس نے محسوس محسوس کیا کہ کملا کو وہ الفاظ کہہ کر اس نے ایک ناقابلِ تلافی جرم کیا ہے۔ اور اُسے اپنے دل میں کملا کے لئے ایک بے پناہ جذبۂ ہمدردی اُمڈتا ہوا محسوس ہوا! اس نے خیال کیا۔ قدرت کا کیا یہ انتہائی ظلم نہیں۔ کہ اس جیسی نرم و نازک دوشیزہ ایک وحشی کے گلے مڑھ دی جائے۔ بیچاری ——— زندگی کے جن ارمانوں کا تصوّر ایک دوشیزہ شادی کے ساتھ کرتی ہے۔ اِس غریب کے لئے شادی سے پہلے ہی ان سب کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ لیکن کیوں؟ کیا اِس لئے کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ اور سماج جس قدر بھی چاہے۔ اس پر ستم ڈھانے کا حق رکھتا ہے؟ بیچاری کس قدر چیخی چلّائی ہو گی۔ اور جب کچھ بس نہ چلا ہو گا۔ تو تھک ہار کر خاموش ہو گئی ہو گی۔ اور خاموش ہونے کے سوا اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ میں مرد ہو کر سماج کے اس ستم کو خاموشی سے برداشت کر گیا۔ تو وہ لڑکی ہو کر کیا کرتی۔ اور اس نے خیال کیا۔ کہ وہ اور کملا ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اور وہ کشتی سماج کی لہروں پر بہی چلی جاتی ہے۔ دفعتاً ایک طوفان آتا ہے کشتی کے ڈکڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں ایک دوسرے کی خبر نہیں رہتی۔ اُسے ہوش آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک کنارے پر اپنی رفیقۂ حیات کی گود میں پاتا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ایکا ایکی اُسے کملا کے چلانے کی آواز آتی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اس جانب دیکھتا ہے۔ اُسے ندی کے دوسرے کنارے پر ایک بدصورت وحشی انسان نظر آتا ہے۔ جو کملا کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ کر کھینچتا لے جا رہا ہوتا۔ اور وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی جدّ و جہد کرتی چیخ چلّا رہی ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ ندی کو پیر کر اس جانب چلا جائے۔ کہ اس کی رفیقۂ حیات اسے بازو سے پکڑ کر روک لیتی ہے۔ وہ تلملا کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔ تو وہ مسکرا کر کہتی ہے۔

"آج آپ نہائیں گے نہیں کیا؟"

"نہانا" ——— اور اس نے محسوس کیا۔ کہ وہ اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ ہنوز اسی چاردیواری میں مقید ہے۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"ہاں نہا لیتا ہوں"

"اس دن سریندر کو نہانے میں مطلقاً کوئی لطف نہ آیا۔ یا شاید قدرت بھی کچھ اُس کے مخالف تھی۔ ٹوتھ برش ملا۔ تو پیسٹ غائب۔ صابن ملا تو تولیہ ندارد۔ درحالانکہ اُسے خوب یاد تھا۔ کہ وہ یہ سب چیزیں نہایت احتیاط سے اپنے ساتھ اٹیچی کیس میں لایا تھا۔ اور نہانے کے بعد بالوں کو آراستہ کرنے کے لئے کنگھی اور آئینہ نے تو ملنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے ایک کمرہ میں سنگھار میز کے قریب یہ سب چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ اس کمرہ تک پہنچ گیا۔ لیکن کمرہ میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

سنگھار میز کے قریب قدِ آدم آئینہ کے مقابل کھڑی کوئی حسینہ اپنے لمبے لمبے گھنگھریالے بالوں کو آراستہ کر رہی تھی۔ سریندر کے کمرہ میں قدم رکھتے ہی اس سرو قدم حسینہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اور ایک عجیب اشتیاق آمیز حیرت سے چلائی۔

"سریندر ——— تم ———!"

کتنا اشتیاق کتنی شیفتگی کس قدر والہانہ وارفتگی ان دو الفاظ میں پوشیدہ تھی۔ سریندر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر اپنے سسرال میں بیٹھا ہے۔ اور دمنتی میٹھی میٹھی دلفریب باتوں سے اس کا جی بہلا رہی ہے۔ دمنتی۔ ہاں۔ اور اس نے خیال کیا۔ کیا یہ ایک حسین خواب نہیں۔ کہ وہ دمنتی جس سے ملنے کی آرزو سنسان و ویران راتوں کی سرد مہری میں بھی اس کے جذبات کو گرمانی رہی ہے۔ ایکا ایکی اُسے اس کمرہ میں مل جائے۔ اس نے

ایک بار ایک بھر پور نگاہ دمنتی کے چہرہ پر ڈالی لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک تیز نوکیلا خنجر اس کے سینہ میں گھونپ دیا ہے۔

چند مٹے مٹے سے نقوش۔ کچھ دُھندلی دُھندلی سی یادگاریں گویہ دیرینہ سالی کے باعث کوئی تصویر مسخ ہو گئی ہو۔ اُسے اپنا سر گھومتا ہُوا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا۔ گویا دمنتی کی موجودہ بدحالی کی تمام تر ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور وہ ایک ایسا گنہگار ہے۔ جس کا گناہ ہر حالت میں ناقابلِ تلافی ہے۔ وہ چند لمحہ اور اس کمرہ میں رہا۔ اُس دوران میں اس کی دمنتی سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اس کا اُسے مطلقاً علم نہیں۔ ہاں جب وہ واپس اپنے کمرہ میں آیا۔ تو اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ اِس صبر آزما ماحول سے جلد از جلد بھاگ جائیگا۔

اسی شام وہ شادی کی ہماہمی میں ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے ملکوال سے چلا آیا۔ لیکن تمام راستہ یہ خیال ایک پریشان خواب کی طرح اس کے دل کو ستاتا رہا کہ کیا وہ گنہگار ہے۔ اور ایک معصوم روح کی بربادی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے؟

سمرنا کے یکے بعد دیگرے اُسے تین خطوط ملے جن میں اس نے بغیر ملے چلے آنے کا نہایت سختی سے شکوہ کیا۔ لیکن سریندر نے مصلحت اسی میں سمجھی۔ کہ اسے کوئی جواب نہ دیا جائے۔

آٹھواں باب

کتنے ہی دن گزر گئے۔ اور اس دوران میں دمنتی کی بدحالی کا تصور عاقبت کے خوف کی طرح رہ رہ کر ہرندر کی نگاہوں کے آگے گھومتا رہا۔ وہ سوچتا۔ کیا اس نے دمنتی کی والہانہ محبت کو سمجھنے سے قاصر رہ کر ایک ناقابلِ تلافی گناہ نہیں کیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ دمنتی کی محبت کو سمجھنے سے کیونکر قاصر رہا۔ وہ اتنا کوتاہ بین کیونکر ہو گیا۔ کہ دمنتی کی محبت آمیز نظروں کو ان توبہ شکن راتوں کے رومان انگیز ماحول میں بھی محض رسمی التفات خیال کرتا رہا۔ اور کبھی یہ جرأت نہ کر سکا۔ کہ اس کی محبت پاش نظروں کا بیباکی سے جواب دے سکے۔ اور معاً اسے وہ وقت یاد آیا جب سسرال سے آتے وقت دمنتی نے اُسے تنہائی میں کہا تھا۔

"آپ تو جاتے ہی ہمیں بھول جائیں گے" اور اس نے جواب دیا تھا۔

"تمہیں دمنتی تمہیں کیا میں بھول سکتا ہوں؟"

"آپ کا کیا ہے"

"کیوں"

"اتنے دن آپ ......"

اور وہ خیال کرتا۔ کاش کہ دمنتی اس دن اپنے جذبات کے اظہار میں اس قدر بخیلی سے کام نہ لیتی۔ کاش کہ وہ خود ہی دمنتی کو اس کے جذبات کے اظہار کے لئے مجبور کر دیتا۔ یا کم از کم اس کے گلے میں بازو ڈال کر اپنی الفت کا اظہار ہی کر دیتا۔ لیکن وہ تو کچھ بھی نہ کر سکا۔ بزدل۔ کم ہمت۔ محبت ناشناس۔ اور وہ خیال کرتا۔ اس نے ایک حسین عورت کی محبت کی قدر نہ کر کے ایک ناقابلِ تلافی گناہ کیا ہے۔ اس کا جرم قابلِ گردن زدنی ہے۔ وہ اسی لائق ہے کہ تنہائیوں میں اپنی کم ہمتی پر آنسو بہاتا رہے اور پھر وہ رہ رہ کر چیخ اٹھتا۔ دفتر میں اس کی بیزاری کی یہ حالت تھی کہ کوئی کام نہ وقت پر انجام نہ دے سکتا تھا۔ اور ایک ایک کام کے لئے اسے کئی کئی بار کہنا پڑتا تھا جب کبھی اسے کوئی کام کہا جاتا۔ تو وہ چونک سا اٹھتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ خوشبوؤں کی سرزمین میں چلتا چلتا کہیں دور بہت دور نکل گیا تھا۔

غرض دن کٹ رہے تھے کہ ایک دن دفتر میں اطلاع آئی۔ کہ افسرانِ بالا دفتر کی پڑتال کے لئے پرسوں تشریف لا رہے ہیں۔ دوسرے دن صبح کی گاڑی سے سرندر کو لاہور بھیجا گیا۔ تاکہ وہ افسرانِ بالا کی تشریف آوری سے قبل بڑے بڑے پھولوں کے ہار منوا کر لے آئے۔ اتفاق سے اسی گاڑی پر اس کا ایک عزیز ترین دوست مسٹر کرشن لال بھی لاہور جا رہا تھا۔ مسٹر کرشن لعل ایک ۲۵ سالہ خوش رو خوش گلو نوجوان شیخوپورہ کے مالدار تاجروں میں سے تھا۔ سرندر کی اس سے خاصی بے تکلفی تھی۔ اس نے سرندر کو مرجھایا ہوا دیکھ کر استفسار کیا۔

"سرندر یار۔ تمہارے چہرہ پر آجکل بادل کیوں چھائے رہتے ہیں"۔

"صرف بادل ہی نہیں"۔ سرندر نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ گھٹائیں جب

برستی رہیں۔ تو اُن کے ساتھ میرا دل اور اس کی سب آرزوئیں خون ہو کر بہنے لگتی ہیں۔"

"ڈاکٹر اقبال سے تلمذ کا شرف شاید تمہیں بھی حاصل ہے۔" کرشن لعل نے اس کی آزردہ روی پر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں" سرندر نے حیرت سے کرشن لعل کے چہرہ پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا لیکن بجائے اس کے کہ کرشن لعل کوئی جواب دیتا۔ اس نے اپنی سوز بھری آواز میں علامہ اقبال کا یہ شعر الاپ دیا ؎

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

ایک حسرت ناک مسکراہٹ سرندر کے چہرہ پر پھیل گئی۔ اس سلئے اور زیادہ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے کرشن"

"تو سمجھا دو" کرشن لال نے بیباکی سے کہا۔ اور خواہش نہ ہونے کے باوجود سرندر نے دمنتی سے اپنی الفت کا سب حال من و عن کہہ سنایا۔ شاید اس کا الفت زدہ دل کوئی سہارا ڈھونڈنے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ پہلے موقعہ پر اس بوجھ کو جو اس کے دل کی آرزوؤں کو کچلتا جا رہا تھا۔ ہلکا کرنے کی کوشش کرے۔ اس لئے کرشن لعل کی معمولی ترغیب اس کے لئے کافی ثابت ہوئی لیکن بجائے اس کے کہ یہ درد بھری داستان سن کر کرشن لعل اس سے اظہار ہمدردی کرتا اس نے دوبارہ ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور ہنستے ہنستے کہا۔

"تم تو بالکل بودم ہو۔"

"کیا مطلب" سرندر نے برانگیختہ ہوتے ہوئے کہا۔

"برہم کیوں ہوتے ہو" کرشن نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا "سچی بات ہمیشہ

کڑوی ہوتی ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا" سرندر نے پھر اسی انداز میں پوچھا۔

"لاہور چل کر بتاؤں گا۔"

لیکن سرندر نے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ لاہور میں وہ ایسے غیر ہمدرد انسان کے پاس ہرگز ہرگز نہ ٹھہرے گا۔ اس نے بیزاری سے چہرہ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ اور مناظر کی دلچسپی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مناظر کی دلچسپی ان غم و غصہ کی لہروں کو جو اس کے سینہ سے پیہم اٹھ رہی تھیں جذب کرنے سے قاصر رہی۔ اور اُسے گاڑی کے فراٹے بھرنے کی صدا کے ساتھ ساتھ دل کی آرزوں کے کراہنے کی صدائیں آتی رہیں۔

لیکن لاہور سٹیشن پر گاڑی کے ٹھہرتے ہی کرشن لعل نے سرندر کا ہینڈ بیگ خود اٹھا لیا۔ اور اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے اس قدر مجبور کیا۔ کہ سرندر کی ایک پیش نہ چلی۔

کرشن لعل کو مہینہ میں کبھی کبھار دو چار یوم کے لئے لاہور آجانا تھا لیکن اس نے گوالمنڈی میں پچیس روپیہ ماہوار پر ایک چھوٹا سا لیکن دلکش مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جب وہ دونوں مکان پر پہنچے۔ اور کرشن لعل نے تالا کھولا۔ تو سرندر نے دیکھا کہ مکان گرد سے اٹا پڑا ہے۔ اس نے طنز سے کہا۔

"کہیں یہاں بھوت تو نہیں رہتے۔"

"بھوت تو نہیں۔ ہاں البتہ ابھی ابھی پریاں آئیں گی اور مکان صاف کر جائیں گی۔"

"تم سارھی باندھنے لگے ہو کیا۔"

"چلو نہیں پہلے ولسیٹ انڈ یہ چا ر پلا لاؤں پھر بات کروں گا۔"

چار مہینے کے بعد جب دونوں دوست واپس آئے تو سرندر کی حیرت نے دیکھا کہ وہ کمرہ جو نصف گھنٹہ پہلے گرد سے اٹا پڑا تھا۔ اب نسیم صبح کی طرح پاکیزہ و شفاف ہے کرشن لعل نے اس کی حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا:

"کیوں ہے نا جادو؟"

"مان گئے یار" سرندر نے معترف ہوتے ہوئے کہا "لیکن اب یہ بتاؤ کہ اسے صاف کس نے کیا۔"

"ٹھیرو ابھی بتاتا ہوں" کہتے کہتے کرشن نے گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکی کو تین بار زور سے تھپ تھپایا۔ پھر کھڑکی کھول دی اور خود ایک آرام کرسی لیکر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا "کیوں کیا بھوت کو بلا رہے ہو" سرندر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھو ابھی بھوت آتا ہے یا پری۔"

"دیکھیں بھئی یہ کیسی پری ہے کہیں وہ بات تو نہیں کہ ؎

سر بہ فلک ہاتھ میں دمدار ستارہ

اور کرشن لعل اپنی سنجیدہ روی کے باوجود مسکرا دیا۔ ایک ہی لمحہ بعد اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"لو وہ آگئی" کرشن لعل نے کسی کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہی اور پھر سرندر کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ سرندر قریب آیا تو اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ سامنے مکان کی چھت پر ایک جواں سال لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی سرندر کو دیکھتے ہی وہ ایک لمحہ کیلئے جھجکی۔ پھر سنبھل کر آنکھوں کے اشارے سے کرشن لعل سے پوچھنے لگی کہ یہ کون ہے۔ کرشن لعل نے دونوں منہ کے گرد رکھتے ہوئے نیز سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بھائی"

اس پر وہ لڑکی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا دی۔ سرندر جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ کرشن لعل چند لمحہ تک اس کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سرندر کی جانب رُخ کرتے کہا۔

" ارے بودم۔ جو تمہاری طرح جھجکتے ہیں ان کی ہمیشہ یہی حالت ہوتی ہے بلا جھجک بحر الفت میں غوطہ لگاؤ۔ عمدہ سے عمدہ موتی خود بخود تمہارے ہاتھ چڑھ جائے گا۔"

سرندر کرشن لعل کی یہ بیباک رائے سن کر جھلا اٹھا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ بحر عشرت میں اندھا دھند کود جانا محبت کہلا سکتا ہے۔ یہ تو صریحاً نفس پرستی ہے۔ اور دمنتی سے اپنے نفس کو تسکین دینے کا خیال اُسے آج تک نہ آیا تھا وہ تو چاہتا تھا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا چاہتا تھا لیکن بہت سوچنے کے بعد وہ صرف یہی سمجھ سکا کہ اس جذبہ کا جو وہ اپنے دل میں دمنتی کے لئے محسوس کر رہا ہے وہ خود تجزیہ کرنے سے قاصر ہے۔

کرشن نے جب اُسے یوں حیران دیکھا تو قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

" بس پڑ گئے ننانوے کے پھیر میں۔ آؤ اب چلیں، شام کو تمہیں اس لڑکی سے گانا سنائیں گے۔ خدا کی قسم اس غضب کا ناچتی ہے کہ . . . . "

" لیکن مجھے تو ماڑی انڈس سے واپس لوٹنا ہے۔"

" اوہ دیکھا جائے گا " کرشن لعل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" نہ نہ یہ نہ ہو سکے گا۔" سرندر نے صورت انکار سر ہلاتے ہوئے کہا۔

. . . .

اس شام ماڑی انڈس پر انٹر کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں کھڑکی کے قریب ایک سیٹ پر ہاروں کی ٹوکری اور اپنا بیگ رکھنے کے بعد جب سرندر

پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے تو رہ رہ کر یہ خیال اس کے دل میں آتا تھا کہ کرشن لعل کی دعوت نہ قبول کرنے میں کہیں اس نے غلطی تو نہیں کی۔ اور اگر وہ رات وہاں رہ کر اس لڑکی کا گانا سن لیتا اور صبح گاڑی سے واپس شیخوپورہ پہنچ جاتا تو آخر کیا ہرج ہوتا۔ بہر حال جن افسروں نے آنا تھا ان کے پہنچنے سے پہلے وہ بخوبی پہنچ سکتا تھا لیکن پھر اُسے خیال آتا۔ کہ مقامی افسران آگے ہی اپنی لاپرواہی کے باعث اُس سے کبیدہ خاطر ہیں۔ اور انھیں ایک اور موقع شکایت کا دینا کسی حالت میں بھی قرین مصلحت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں پلیٹ فارم پر مضطربانہ ٹہلتا رہا۔ حتیٰ کہ ساڑھے آٹھ بج گئے۔ انجن نے وسل دی۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ سرندر لپک کر اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ کمرہ میں پہنچتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ جب کمرہ میں وہ محض ایک دو مسافر چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ اس نے اپنی سیٹ پر نگاہ ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے سامان کے ایک جانب ایک بوڑھی خاتون بیٹھی ہے اور دوسری جانب دو نوجوان لڑکیاں۔ اور اس کے بیٹھنے کے لئے وہاں تو کیا کمرہ میں کہیں بھی جگہ موجود نہیں مجبوراً اس نے سامان کو اٹھا کر سیٹ کے نیچے رکھدیا اور خود سامان کی جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار پھر ایک تیز نگاہ کمرہ میں چہار جانب ڈالی جو دوڑتی ہوئی ان لڑکیوں پر ایک لمحہ کے لئے رُکی۔ پھر نیچے جھک گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ والی لڑکی گو خاصی شکیل ہے۔ لیکن اُس کی ہمراہی لڑکی بلکے تیز نقوش رکھتی ہے۔ اور ابھی وہ دل ہی دل میں ان دونوں لڑکیوں کے نقوش کا مقابلہ کر رہا تھا کہ اس تیز نقوش والی لڑکی نے سرندر کے ساتھ والی لڑکی نے کہا۔

"بہن اگر تم اس جانب ہو جاؤ تو میں یہاں ذرا لیٹ جاؤں"!

سامان اٹھ جانے سے جگہ کچھ بڑھ گئی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہاں کوئی

لیٹ سکے۔ وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی یہاں کس طرح لیٹنے کا اہتمام کرے گی کہ سامنے سے ایک ہٹے کٹے نوجوان سردار نے سرندر کے ساتھ والی لڑکی سے پوچھا۔

"اجیت کیا کہتی ہے تمہاری بھابی"

"بھابی لیٹنا چاہتی ہے"

"تو لیٹ جانے دو۔ تم آجاؤ ادھر میرے پاس" اور اس نے اپنے ساتھ والے ادھیڑ عمر سردار سے کہا۔ "بابا تم ذرا ادھر سرک جاؤ میں بھی ادھر سرک جاتا ہوں اجیت کے لئے جگہ بن جائے گی"

اجیت اٹھ کر سامنے والی سیٹ پر چلی گئی تو سرندر نے خیال کیا۔ اجیت شاید اس سردار کی بہن ہے اور یہ ادھیڑ عمر کا سردار شاید ان کا باپ ہے۔ اور اغلباً یہ تیکھے نقوش والی لڑکی جوان سردار کی بیوی۔ اس نے ایک تیز نگاہ اس ہٹے کٹے سردار پر ڈالی۔ اور اس کی خونی نگاہیں دیکھ کر کانپ اٹھا۔

معاً اسے اپنے دائیں ہاتھ پر بوجھ سا محسوس ہوا اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ تیکھے نقوش والی لڑکی اس کے ہاتھ کو تکیہ بنائے مزے سے لیٹ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں کے آگے نوجوان سردار کی خونی آنکھیں پھر گئیں۔ اس نے خیال کیا کہ آج بدقسمتی اُسے کھینچ کر اس کمرہ میں لے آئی ہے۔ اس نے چاہا کہ اپنا ہاتھ کھینچ لے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کہیں یہ لڑکی جو شاید یہ نہیں جانتی کہ اسکا ہاتھ اس کے سر کے نیچے ہے۔ اس کے ہاتھ کھینچنے کا مدعا کچھ سے کچھ سمجھ لے اور مفت میں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لیکن وہ اپنے ہاتھ کو اس حالت میں بھی تا کبے رکھ سکتا تھا۔ اگر ایسے میں بھی سردار صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی تو نتیجہ کسی حالت میں بھی تسلی بخش نہ ہوگا۔ اس نے ایک کانپتی نگاہ سردار صاحب پر ڈالی

سردار اپنی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا

گاڑی رات کے سکوت میں ایک دہشتناک سنسنی پیدا کرتی تیزی سے جا رہی تھی اور سمندر کا دل بھی اُسی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ معاً اس میز نقوش والی لڑکی نے کروٹ لی اور چہرہ کھڑکی کی جانب کر لیا۔ سمندر نے جلدی سے اپنا ہاتھ سرکا لیا اور اسے کھڑکی سے باہر نکال کر دوسری کھڑکی فریم میں شیشے اور تختوں والے چوکھٹوں پر رکھ دیا۔

ایک ہی لمحہ بعد اس لڑکی کا سر سرکتا ہوا سمندر کے زانو سے آ ملا۔ سمندر دل ہی دل میں کانپ اٹھا اور ابھی وہ اس نئی آفت سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ اس لڑکی کے سراپا میں کچھ جنبش ہوئی۔ دوسرے ہی لمحہ اس کا نرم و ملائم ہاتھ کھڑکی میں سمندر کے ہاتھ کے اوپر تھا۔ سمندر کی روح تک کانپ اٹھی۔ اس نے ایک بار جھجکتے ہوئے نوجوان سردار کی جانب دیکھا اور اسے اونگھتا ہوا دیکھ کر تسکین کا گہرا سانس لیا۔

اُن نرم ملائم انگلیوں کا بار اس کے ہاتھ پر سخت ہوتا گیا۔ سمندر نے محسوس کیا کہ یہ سب کچھ سہواً نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنے خاوند، سسر اور نند کی موجودگی میں یہ نرم و نازک معصوم سی لڑکی اس بیباکی سے یہ جرأت کر سکتی ہے، یہ بھی قبول کرنے کا اسے حوصلہ نہ ہوا۔

معاً اسے کرشن لال کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔

" ارے بودم۔ جو تمہاری طرح جھجکتے ہیں ان کی ہمیشہ یہی حالت ہوتی ہے۔ بلا جھجک بحر الفت میں غوطہ لگا دو۔ عمدہ سے عمدہ موتی خود بخود تمہارے ہاتھ چڑھ جائے گا۔"

اور اس نے بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھ کی چھنگلی سے اس خوابیدہ حسینہ کی چھنگلی کو دبا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کرشن لال کے الفاظ کا سحر ٹوٹ گیا اور وہ انجام کا خیال

کرتے ہی اپنی جرأت پر خود کو دل ہی دل میں کوسنے لگا۔

لیکن جب دوسرے ہی لمحہ اس نرم ملائم چھنگلی نے سرندر کی چھنگلی کو بالکل اُسی کے سے انداز سے دبایا تو وہ سوچنے لگا کہ اُسے اپنی جسارت پر خوش ہونا چاہیئے یا غمزدہ لیکن باوجود اس ترغیب کے اُس نے موقعہ ملتے ہی اپنا ہاتھ جلدی سے کھینچ لیا اور اسے کھڑکی سے باہر لٹکا رہنے دیا۔ دوسرے ہی لمحہ اس لڑکی کا ہاتھ بھی کھڑکی سے باہر لٹکنے لگا۔

سرندر اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ سردار صاحب کا اتنا خوف ہونے کے باوجود کس طرح اس کا ہاتھ کھڑکی سے باہر سرکتے سرکتے اس حسینہ کے ہاتھوں تک پہنچ گیا اور کس طرح اس نے جرأت کر کے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ چند ہی لمحوں بعد وہ پیارا پیارا ملائم ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اُسے آہستہ آہستہ پیار سے دبا رہا تھا۔

چند ہی لمحہ بعد اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ حسینہ اپنا ہاتھ کھینچ رہی ہے۔ اس نے خوف سے کانپ کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کر اپنی جگہ محتاط ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ان نرم ملائم انگلیوں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور محبت کی پوری شدت کے ساتھ تین بار زور سے دبایا۔ سرندر دل ہی دل میں ان نرم ملائم انگلیوں کے بار کی لذت سے جھوم اٹھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ اب یہ حالت تھی کہ جہاں کہیں سٹیشن آتا یہ دونوں ہاتھ علیحدہ علیحدہ ہو جاتے لیکن گاڑی کے چلتے ہی پھر کوئی برقی طاقت ایک کو دوسرے پر چسپاں کر دیتی۔

گاڑی چیچو کی ملیاں سے چلی تو سرندر نے خیال کیا کہ اس خواب کی طرح دلکش حسینہ سے اس کی الفت کی یہی ابتدا اور انتہا ہے۔ اگلے سٹیشن پر وہ اُتر جائے گا

اور یہ حسینہ نامعلوم تاریکیوں میں غائب ہو جائے گی۔ ایسا کیوں ہے۔ اگر یہ حسینہ اسکی زندگی سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی تو کیوں اسے اس بیدردی کے ساتھ اسکے راستہ میں ڈالا گیا۔ کیا وہ ان نرم و ملائم انگلیوں کے حلاوت آمیز بار کو کبھی بھول سکتا ہے۔ اگر نہیں تو کیا یہ اس پر انتہائی ستم نہیں کہ چندہی لمحہ بعد یہ حسینہ اس کے لئے خواب سے زیادہ معنی نہ رکھے گی۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کے لئے محض اس کے ہاتھوں کا نرم ملائم بار ہی کیوں لکھا ہے۔ کیوں نہیں وہ ان بلور کی طرح شفاف انگلیوں کو ایک پراشتیاق بوسہ دے سکتا۔ اور ایکا ایکی اسے خیال آیا کہ اتنا تو وہ اب بھی کر سکتا ہے۔ اس نے سر کو کھڑکی کے باہر جھکا دیا اور ان نرم و ملائم انگلیوں کو آہستہ آہستہ کھینچتے ہوئے اپنے لبوں سے لگا لیا۔

معاً انجن نے وسل دی اور سرندر نے دیکھا کہ گاڑی کا انجن شیخوپورہ سٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے جلدی سے ایک بار پھر اُن لانبی لانبی بلوریں انگلیوں کو ایک پراشتیاق بوسہ دیا اور پھر درمیانی انگلی کو آہستہ سے دانتوں سے دبا کر چھوڑ دیا۔

سٹیشن آیا تو سرندر نے کسی قلی کو آواز دیئے بغیر خود ہی ایک ہاتھ میں ہینڈ بیگ اٹھایا اور دوسرے میں پھولوں کی ٹوکری لیکر حسرت بھری نظروں سے اس برق مجسم حسینہ کی جانب دیکھتا ہوا گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ پلیٹ فارم پر اتر کر اس نے گاڑی کے عین مقابل اپنا سامان رکھ دیا اور گاڑی چلنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ حسینہ بھی کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس کی جانب ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی ایکا ایکی اسے خیال آیا کہ کیوں نہ اس حسینہ کے کھڑکی سے باہر لٹکتے ہوئے ہاتھ کو ایکبار پھر اپنے ہاتھ میں لیکر دبائے۔ خیال کا آنا تھا کہ وہ ایک اشتیاق آمیز جنبش کے ساتھ آگے بڑھا۔ لیکن وہ حسینہ اُسے آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

اور اس نے اپنا ہاتھ بھی کھینچ لیا۔ وہ اس سراسیمگی کو کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن وہ اب کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس لئے اس نے آگے بڑھکر اس انداز سے اپنی سیٹ پر جھانکا گویا وہ کوئی چیز بھول گیا ہے۔ لیکن وہاں کچھ ہوتا تو ملتا۔ البتہ اس کی دزدیدہ نگاہوں نے سامنے بنچ پر اس نوجوان سردار کو آنکھیں کھولے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ وہ اس حسینہ کی سراسیمگی کا راز سمجھ گیا۔ اس نے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا اور پھر سے اپنی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اب اسے خوف تھا کہ وہ حسینہ کھڑکی سے باہر جھانکنے کی جرأت بھی نہ کر یگی لیکن دوسرے ہی لمحے اس حسینہ کا دلفریب چہرہ مدہوش کر دینے والی نگاہوں کے ساتھ کھڑکی سے اسکی جانب جھانک رہا تھا۔ اتنے میں گاڑی چل نکلی۔ اس نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں لبوں سے لگا کر ایک بوسہ اس کی جانب لہرا دیا۔ اس نے دیکھا اس حسینہ کے ہاتھ کی دو انگلیاں بھی لبوں تک پہنچ گئی ہیں۔ پھر آگے بڑھتی ہوئی گاڑی رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں جذب ہو گئی۔

(۲)

دمنتی کی یاد پھر کچھ معنی رکھتی تھی لیکن اس نا معلوم حسینہ کا تصور کرتے ہی سرندر کو اپنے سینہ میں ایک عجیب طرح کی خلش محسوس ہوتی۔ وہ حیران تھا کہ اس قدر جذبات انگیز ملاقات کے باوجود وہ ایک دوسرے کے نام سے نا آشنا تھے چہ جائیکہ اسے اس فتنہ اثر حسینہ کے حسب و نسب یا اس کی جائے رہائش سے آگاہی ہوتی۔ لطف تو یہ تھا کہ اس شہد سے میٹھی انگلیوں والی نے بھی اس کا نام تک پوچھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ ایک جان نواز شمیم کی طرح اس کی زندگی میں آئی تھی اور اس کے جسم سے ٹکرائی ہوئی اس کی نظروں سے اٹھکیلیاں کرتی، اس کے سینہ میں تلاطم بپا کرتی، خوابوں کی دنیا میں دیگر دھندلے عکسوں کے ساتھ ملط ہو گئی تھی۔ وہ سوچتا

زندگی کے تلاطم خیز لمحوں میں اگر اُسے کفِ بار موجوں کی طرح اس کے دل کے ساحل سے ٹکرا کر نابود ہو جانا تھا، تو وہ اس کی زندگی میں کیوں آئی۔ کیا آگے ہی اس کی زندگی میں نامرادیاں کم تھیں کہ وہ ایک اور کا اضافہ کر گئی۔ پھر اسے کرشن لعل کے الفاظ کی یاد آئی۔ اور وہ خیال کرتا کہ اگر وہ کرشن لعل کے الفاظ کی تحریک پر اس نرم ملائم جھنگلی کو اپنی جھنگلی سے دبانے کی جسارت نہ کرتا تو کیا وہ اس صبر آزما خلش سے محفوظ نہ رہتا۔ لیکن کہاں۔ اگر اس کے مقدر میں درد و کرب کے کچو کے کھانا لکھا تھا تو وہ اس سے محفوظ کیسے رہ سکتا تھا اور پھر وہ تقدیر کو کوسنے لگتا۔

یوں ہی تقدیر کو کوستے کوستے کئی ماہ گذر گئے حتیٰ کہ ایک روز پھر اُسے ایک شادی پر بلاوا آیا۔ دمنتی کے چچا زاد بھائی کی شادی تھی۔ اس کے سینہ میں ایک ترنگ سی اٹھی۔ اس نے خیال کیا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایک بار پھر دمنتی سے مل کر اُس صبر آزما خلش کا، جو ایک ناقابلِ فہم عذاب کے مانند ہر وقت اسے مضطرب رکھتی ہے، اگر ممکن ہو سکے تو خاتمہ کر دے اور وہ خیال کرتا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنی پشیمانیوں سے دمنتی کو آگاہ کر کے وہ اس فحش غلطی کی جو اس نے دمنتی کی والہانہ محبت کو نہ پہچاننے میں کی ہے، تلافی کر سکے اور اس کا دل کہتا کہ ہاں ایسا ہونا ممکن ہے۔ اے کاش کہ ایسا ہو جائے۔

بڑی جدوجہد سے اس نے پانچ یوم کی رخصت حاصل کی اور پہلی گاڑی سے سنگھوئی کے لئے چل پڑا۔ شاہدرہ باغ اسٹیشن پہ اسے جہلم جانے والی گاڑی کی انتظار کرنا پڑی۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور اٹیچی کیس سے ایک کتاب نکال کر مطالعہ کرنے لگا۔ اتنے میں نارووال جانے والی گاڑی آئی۔ سرندر کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تاکہ کسی آدمی کو اٹیچی کیس کا خیال رکھنے کیلئے

کہہ جائے۔ بنچ کے قریب ہی ایک خاتون دھانی رنگ کے سوٹ میں ملبوس اپنے ٹرنک پر بیٹھی تھی اور اس کا رخ سرندر کے بنچ کی جانب ہی تھا۔ سرندر نے محسوس کیا کہ اس خاتون کی موجودگی میں کوئی اسکے اٹیچی کیس کو چھیڑنے سے رہا۔ اس لئے وہ کسی کو کچھ کہے بغیر بلا تردد سیکنڈ کلاس کے ایک کمرہ میں پیشاب کی حاجت کو رفع کرنے کے لئے چلا گیا۔ دو ہی منٹ بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ خاتون اس کی جگہ بنچ پر بیٹھی کمال متانت سے اس کے اٹیچی کیس کی چھان بین کر رہی ہے۔ وہ اس خاتون کی دیدہ دلیری دیکھکر حیرت زدہ ہو گیا اور تیز تیز قدم چلتا ہوا بنچ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ خاتون اسے اتنی جلدی واپس لوٹتا دیکھکر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ سرندر نے تیز نگاہیں اس خاتون کے چہرہ پر ڈالتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپ رک کیوں گئیں۔ ابھی تو آدھی چیزیں اٹیچی کیس ہی میں پڑی ہیں۔"

"جی میں تو ...." اور اس سے آگے وہ خاتون کچھ نہ کہہ سکی

"جی آپ تو .... کہئے نا۔ چپ کیوں ہو گئیں۔ سرندر نے پھر اسی انداز میں پوچھا۔

اور اس خاتون نے ایک ایسا نامعقول بہانہ کیا جو صرف عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ اس نے کہا۔

"جی میں نے تو ایسے ہی تالے کو ہاتھ لگایا اور تالا خود بخود کھل گیا۔"

"اور یہ کپڑے، یہ کتابیں، یہ کریم کی ڈبیہ، یہ سب باہر کیسے آ گئے۔" سرندر نے تلخی سے پوچھا۔

لیکن اس خاتون کے پاس اس بات کا کوئی جواب ہوتا تو وہ دیتی۔ وہ خاموش رہی۔ سرندر کا غصہ اس کی خاموشی سے اور بھی بھڑک اٹھا۔ اس نے تلخ تر انداز میں کہا

" آپ بولیں گی کہ میں بلاؤں پولیس کو"

پولیس کا نام سنتے ہی جیسے کسی نے اس خاتون کی روح سلب کر لی. اس کا رنگ سوکھے پتے کی طرح زرد ہو گیا۔ اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا.

"مجھے معاف کر دیجئے"

" معاف کر دوں۔ کیوں؟" سرندر نے غصہ سے کپکپاتے ہوئے کہا" یہ اٹیچی کیس کیا تمہارے باپ کا تھا جو کھولنے بیٹھ گئیں؟"

" آہستہ بولئے" اس خاتون نے گڑگڑا کر سرندر کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ لیکن اس خاتون کی پیش بندی بعد از وقت تھی. کیونکہ سرندر کی تیز غصہ بھری آواز نے پیشتر ہی کئی آدمیوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا اور وہ اردگرد اکٹھا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور ہر ایک معاملہ سے آگاہ ہو کر اپنی اپنی رائے بلا طلب پیش کرنے لگا تھا. کسی نے کہا کہ اسے پولیس کے حوالہ کر دینا چاہیئے، کسی نے رحم کی سفارش کی اور ایک نے سب سے پہلے اٹیچی کیس کی اشیاء گن لینے کی تجویز پیش کی۔ سرندر کو سب سے زیادہ اس کی رائے پسند آئی اور وہ اپنی یادداشت کے مطابق اشیاء گننے لگا۔

سرندر اشیاء گن رہا تھا۔ اور وہ خاتون شرم سے زمین میں دھنسی جا رہی تھی اشیاء گن چکنے کے بعد سرندر نے ایک تیز نگاہ اس خاتون پر ڈالی لیکن اس کی پریشان حالی اور احساس ندامت کو دیکھکر اس نے محسوس کیا کہ اس کیلئے یہی سزا کافی ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے زیادہ بکھیڑا کرنے کے بجائے لاپرواہی سے اس کی جانب سے نظریں ہٹا لیں۔ اور پھر سے کتاب کا مطالعہ کرنے لگا. سرندر کو یوں خاموشی سے مطالعہ میں مصروف ہوجاتا دیکھکر مجمع بھی کھسکنے لگا اور چند ہی لمحوں میں

جو جس سمت سے آیا تھا اسی سمت پلٹ گیا۔ اس خاتون نے جب اردگرد کوئی آدمی نہ دیکھا تو سرک کر سرندر کے قریب آگئی اور کہنے لگی۔

"آپ نے میرے حال پر بہت مہربانی کی"

"ہوں" سرندر نے بیزاری سے جواب دیا۔

"آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے تو میں کہیں کی نہ رہتی"

"اب تو بچ گئیں نا" سرندر نے خشک انداز میں کہا۔ "پھر اب کیا چاہتی ہو"

"آپ مجھے ساتھ لے چلیں"

سرندر اس خاتون کے یہ الفاظ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

"کیا کہتی ہو" اس نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

"میں آپ کی کوئی خدمت کرنا چاہتی ہوں"

اٹیچی کیس میں سے کچھ چاہیئے"

"آپ کا دیا بہت کچھ ہے"

"پھر مجھ پر رحم کیجئے"

"آپ ہی مجھ پر رحم کریں اور مجھے اپنی خدمت کا موقعہ دیں۔"

"مجھے معاف کرو بابا" سرندر نے تلخی سے کہا اور اٹیچی کیس اٹھا کر دوسری جانب چل دیا۔

سرندر حیران تھا کہ یہ کس بلا کی عورت ہے کہ خواہ مخواہ گلے پڑنے کو تیار ہو رہی ہے۔ اس کی جرأت دیکھو کس متانت سے میرے اٹیچی کیس کی چھان بین کر رہی تھی گویا یہ اس کی اپنی ملکیت تھا اور وہ سوچنے لگا آج تک مردوں کو عورتوں کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے دیکھا تھا لیکن ایسی دیدہ دلیری عورتوں میں دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ واقعی زمانہ بدل رہا ہے اور اس سے خیال کیا کہیں وہ وقت تو قریب نہیں

آ رہا جب مردوں کو گھونگھٹ نکال کر چولہا جھونکنا پڑے گا اور عورتیں بازاروں اور گلی کوچوں میں دندناتی پھریں گی۔ اور اسے فلم "الٹی گنگا" کی یاد آ گئی۔ طبیعت کی بیزاری کے باوجود وہ مسکرا دیا۔ وہ سوچنے لگا محبت کے اظہار کا یہ طریقہ بھی اپنی نوع کا نرالا ہی ہے "میں آپ کی کوئی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔" لیکن کس کمبخت کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے۔ مجھے کیا اپنی جان کی سلامتی کی ضرورت نہیں کہ تم سے ٹکر لوں گا۔

اور وہ اپنے خیالات میں مست دوسری جانب سے آتے ہوئے ایک موٹے سے آدمی سے ٹکرا گیا۔ "معاف کرنا" دونوں نے بیک وقت مسکراتے ہوئے کہا۔ گویا یہ ٹکر بھی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ تھا اور وہ سوچنے لگا ہماری تہذیب بھی عجب مضحکہ خیز ہے۔ آپ بے توجہی سے تجارت کا پانی کھڑکی سے باہر پھینکتے ہیں اور وہ ایک شریف آدمی کے کپڑوں پر گرتا ہے۔ وہ غصہ سے لال بھبوکا ہو کر آپ کی جانب دیکھتا ہے۔ آپ جھٹ متانت سے کہتے ہیں "معاف کرنا" اور یہ الفاظ اُسے پھر سے مہذب بنانے کے لیئے کافی ثابت ہوتے ہیں۔ وہ مسکرا کر کہتا ہے "جی کوئی بات نہیں۔" اور اگر آپ یہ الفاظ نہ کہتے تو شاید وہ آپ کا خون کرنے پر تل جاتا۔

ایکا ایکی انجن کی وسل نے اسے چونکا دیا۔ گاڑی سٹیشن کی حدود میں داخل ہو چکی تھی

صبح چار بجے کے قریب گاڑی جہلم سٹیشن پر پہنچی۔ اس وقت مطلع ابر آلود ہو کر ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔ سرندر نے یہی مناسب سمجھا کہ رات کے بقایا لمحے ویٹنگ روم میں بسر کر دے۔ اور صبح ہوتے ہی تانگہ لے کر سنگھوئی چل دے۔

لیکن صبح ہوتے ہی بادل گھر کر آ گئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ۳ بجے کے قریب بارش قدرے تھمی۔ اور سرندر تانگہ لیکر سنگھوئی کی جانب چل دیا لیکن چھاؤنی گذرتے گذرتے پھر بارش تیز ہو گئی اور چنگی پر پہنچتے پہنچتے تو بارش نے طوفان کی سی شدت اختیار کر لی۔ سرندر نے یہی مناسب سمجھا کہ تانگہ چھوڑ کر چنگی کے دفتر میں کچھ عرصہ انتظار کرے حتیٰ کہ بارش تھم جائے۔ وہاں چنگی کے دفتر میں چند ایک اور سنگھوئی کو جانے والے مسافر بارش تھمنے کے منتظر ملے۔ باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ ان ہی مسافروں میں دو ایسے بھی ہیں جو اسی شادی کے سلسلہ میں دلہن والوں کی طرف سے شہر سے چند ضروری اشیاء خرید کر واپس لوٹ رہے تھے اس نے ان کی رفاقت کو ہی غنیمت سمجھا اور اب وہ ایک سے تین ہو گئے۔ خدا خدا کر کے بارش تھمی لیکن اب تانگہ والوں نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس سے آگے سڑک کچی تھی اور کچی سڑک پر اس بارش کے بعد تانگوں کو لے جانا جان جوکھوں میں ڈالنے والا معاملہ تھا۔ لہذا یہی صلاح ہوئی کہ اس وقت واپس شہر کو لوٹ چلیں اور کسی ہوٹل سے کھانا وغیرہ کھا کر دوپہر کو ایک بجے کے قریب پھر سفر اختیار کریں۔ اس لئے وہ تینوں واپس شہر لوٹ گئے لیکن کھانا کھاتے کھاتے پھر بادل گرجنے لگے اور ہلکی ہلکی بوندیں برسنے لگیں۔ اس کے دونوں ساتھی گھٹاؤں کا یہ رنگ دیکھ کر ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ لیکن سرندر کی ہمت کے لئے دمنتی کا تصور تازیانے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب چاہے موت کے منہ میں بھی کیوں نہ جانا پڑے وہ وہاں تک پہنچ کر دمنتی سے ملے بغیر واپس نہ لوٹے گا۔ اسی نے اسی وقت تانگہ منگوایا اور ننھی ننھی بوندوں کو خاطر میں لائے بغیر تانگہ پر سوار ہو گیا۔ اس کی اس جرأت نے ان مسافروں کو بھی ہمت دلائی اور وہ بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی سے چنگی تک پہنچتے پہنچتے پھر شدید بارش کی صورت اختیار

کری اور ایک دفعہ پھر انہیں اسی جنگی کے دفتر میں بارش تھمنے کا انتظار کرنا پڑا۔ بارے بارش تھمی۔ اب تانگے والے کا آگے جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس لئے اُن ساتھیو نے واپس لوٹ چلنے کی صلاح دی۔ لیکن سرندر نے ہرچہ بادا باد کے بمصداق اس سات میل لمبے ناہموار کچے راستہ کو پیدل ہی طے کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے اس ارادہ سے آگاہ ہونے پر ان مسافروں نے اسے سمجھایا کہ راستہ میں گھان (ایک برساتی نالہ) بہتا ہے جو اس بارش کے باعث زوروں پر ہوگا اور چونکہ اس نالہ پر کوئی پل نہیں اس لئے اسے اس طوفانی حالت میں عبور کرنا موت کے منہ کودنا ہی ہوگا۔ لیکن سرندر تو موت کے منہ میں کودنے کے لئے تیار ہو رہا تھا اس لئے اس نے ان کی سُنی اَن سُنی ایک کردی اور جرابوں کو پتلون کے اوپر چڑھاکر اٹیچی کیس اور چھڑی ہاتھ میں لے آگے بڑھ نکلا۔ اس کی اس جوان ہمتی نے چند ایک اور آدمیوں کو بھی مرعوب کرلیا اور وہ بھی ساتھ چل دیئے۔ کچی سڑکیں اپنی ناہمواری کے باعث یوں ہی ایک مصیبت ہوتی ہیں۔ بارش نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ جگہ جگہ پانی کے رُک جانے سے کیچڑ اور پانی کی چھوٹی چھوٹی دلدلیں سی بن گئی تھیں۔ ہر قدم پر یہی خدشہ ہوتا تھا کہ اب پاؤں پھسلا اور اب سوٹ پر کیچڑ کا پلستر پھرا اور اٹیچی کیس کی دُرگت بنی۔ کئی جگہ پاؤں پھسلتے پھسلتے بچا۔ لیکن اس جواں ہمت نے رُکنے کا نام نہ لیا۔ نئے بوٹ کیچڑ سے لت پت ہوگئے۔ جرابوں پر کیچڑ کی چھینٹوں سے کوڑھ پھوٹ پڑا۔ لیکن وہ حتی الامکان کیچڑ اور پانی کی زد سے بچتا، اپنے مقدر کی طرح بل کھاتا آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں اِکے دُکے آنے والے مسافروں سے اس نے راستے کی کیفیت پوچھی لیکن ہر جگہ حوصلہ شکن جواب پانے کے باوجود اس نے دامن ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ نون گراں کے قریب پہنچتے پہنچتے اُسے معلوم ہوا کہ گھان میں پانی طوفانی شدت اختیار کرچکا ہے۔ وہ پھر

بھی آگے بڑھتا گیا گھاں کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے معلوم ہوا کہ گھان کا بند ٹوٹ گیا ہے اور پانی شدت سے نون گراں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی گھان کے کنارے ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے۔ یہاں پہلے بھی چند ایک مسافر گھان کے پانی کی تندی اور اپنی بے بسی کا ملاحظہ کر رہے تھے۔ گھان کا پانی زنا لے بھرتا، اچھلتا، کودتا، ایک لرزا دینے والا ہنگامہ بپا کرتا بڑھ رہا تھا۔ ادھر بند ٹوٹ جانے کے باعث نون گراں کی بشت پر بھی اب پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ جو اپنی لرزا دینے والی سنسنی کے ساتھ ٹیلوں اور گڑھوں کو ہموار کرتا جا رہا تھا۔ سرندد نے جب پلٹ کر گھان پر نگاہ ڈالی تو اس کی تندی کو دیکھ کر اس کا دل کانپ اٹھا پانی تھا کہ برق کی سی تیزی اور کڑک سے بہہ رہا تھا۔ سرندر نے خیال کیا کہ آج شاید زمین آسمان بننے والی ہے۔ ورنہ ایک چھوٹے سے پہاڑی برساتی نالے میں یہ تندی اور بے رحمی کہاں سے پیدا ہو جاتی۔ لہریں تھیں کہ تین تین فٹ اونچی اچھل رہی تھیں اور ایک لہر دوسری لہر کا اس تیزی سے تعاقب کر رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کوئی نامعلوم کشش اپنی جانب صبا کی سی تیز رفتاری سے کھینچے لئے جا رہی ہے۔ لہروں کا لامتناہی سلسلہ تھا جو قریب قریب ایک میل کی وسعت میں کسی کی پامال آرزوؤں کی طرح سر پٹک رہا تھا۔ سرندر کو لہروں کی اس چیخ و پکار میں اپنی آرزوئیں کراہتی محسوس ہوئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ قدرت اپنی تمام بے رحم طاقتوں کے ساتھ اس کے ارادوں کے سامنے سپر انداز ہو رہی ہے اسے اپنا سر جھکراتا محسوس ہوا اور اس نے خیال کیا شاید اس کے مقدر ہی میں اس کی آرزوؤں کا سر پٹک پٹک کر دم توڑ دینا لکھا ہے۔ ورنہ اس کے پختہ عزائم کے سامنے یہ خندقیں کھود نے کا قدرت کا اور کیا منشاء ہو سکتا ہے۔ قدرت بے رحم قدرت جو ہر اولوالعزم انسان کے آگے سد سکندری کھڑی کر دیتی ہے۔ خدا جانے

اسے بے بس انسانوں کو تڑپا نے میں کیا مزا آتا ہے۔ اور اس نے ایک منتقمانہ نگاہ گھاٹ کی امنڈتی ہوئی لہروں پر ڈالی۔ اُسے یہ لہریں عالی حوصلہ انسانوں کی تڑپتی ہوئی قبریں نظر آئیں۔ ہاں تڑپتی ہوئی۔ کیونکہ مرجانے کے باوجود ان کی تشنۂ تکمیل آرزوئیں ابھی تک تڑپ رہی تھیں۔ اس نے خیال کیا کہ آج اُسے بھی ان تڑپتی ہوئی قبروں کے پہلو میں ایک اور قبر کا اضافہ کرنا ہوگا اور باوجود عالی حوصلہ ہونے کے اس نے ایک گہرا لمبا سانس لیا۔ وہ دمنتی سے مل کر اظہار الفت کر چکنے کے بعد مرنے کا قائل تھا لیکن قبل از وقت یہ موت اسے کچھ ضرر آزما محسوس ہوئی۔ اس نے بیقرار نگاہ چہار سو ڈالی۔ چند مسافر ایک بوڑھی کھجور والی سے کھجوریں خرید کر کھا رہے تھے۔ کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اور باقی گھاٹ کی امنڈتی ہوئی لہروں کے زیر و بم پر فقرے تراش رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی ایسا نظر نہ آتا تھا جو اس کی طرح گھاٹ کو عبور کرنے کے لئے بیقرار نظر آتا ہو۔ کنارے پر چند ایک اسی بستی کے ننگ و دھڑنگ آدمی بھی تھے جن کے لئے گھاٹ کی لہروں کا اتار چڑھاؤ دلچسپی سے خالی نہ تھا اور جو رہ رہ کر گھاٹ میں کود کر پیرتے ہوئے لہروں تک پہنچ جاتے تھے اور پھر کمال بے فکری سے ہاتھ چلاتے ہوئے واپس آجاتے تھے۔ سرندر کو ان ننگ و دھڑنگ آدمیوں پر رشک آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ کاش کہ وہ بھی ان ملبوسات سے پیراستہ نہ ہوتا تو ان ننگ و دھڑنگ آدمیوں کی طرح بے فکری سے گھاٹ کو پیرتا ہوا اس کنارے پر پہنچ جاتا۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس ننگ دھڑنگ حالت میں سنگھوئی پہنچ کر کیا لیتا۔ اسے تو گاؤں کے کتے ہی گاؤں میں قدم نہ رکھنے دیتے۔ وہ سوچنے لگا حسین عورتوں کے ساتھ یہ کتے کہاں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ لیلیٰ کا کتا مجنوں کو کاٹتا تو نہ تھا۔ پھر یہ سنگھوئی کے کتے۔ اور اس نے خیال کیا۔ کاش وہ مجنوں کے زمانہ میں پیدا ہوتا۔ کم از کم اُسے کتوں

سے کاٹے جانے کا خوف تو نہ رہتا اور معاً اسے کسولی کی یاد آئی۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ ایک ڈاکٹر نما انسان اس کے پیٹ میں ٹیکہ گھونپ رہا ہے۔ وہ شدتِ خوف سے کانپ اٹھا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ بھی عجیب انسان ہے کہ سنگھوئی پہنچتے پہنچتے کسولی جا پہنچا۔ بھلا سنگھوئی سے کسولی کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ تو پھر

دھو و ـــــــ اور اس کے پہلو سے ایک کتا زور سے بھونکا۔ اس نے خیال کیا کہ اب لمحہ بھر میں ہی یہ کتا اسے کاٹ کھائے گا اور پھر کسولی اور وہ ڈاکٹر کے ٹیکوں کا تصور کرتے ہی آنکھیں بند کر کے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لیکن دو لمحے تک جب اسے کسی نے پہلو میں نہ کاٹا تو اس نے آہستہ سے جرأت کر کے اس جانب جھانکا۔ چند لڑکے ایک مریل سے کتے کو چھیڑ رہے تھے اور وہ کسی کسی وقت تنگ آ کر بھونک دیتا تھا۔ اس نے تسکین کا ایک گہرا سانس لیا اور پھر سے نگاہیں گھاٹ کی لہروں پر ڈالیں۔ گھاٹ کا پانی اب بھی اسی تندی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ یوں گھاٹ کی لہروں کو گننے سے تو بہتر ہو گا کہ چند لمحے سستا لیا جائے۔ اس نے اٹیچی کیس کا تکیہ بنایا اور وہیں ہری ہری گھاس پر لیٹ رہا اور باوجود سینہ میں ہلچل مچی ہونے کے وہ چند ہی لمحہ بعد نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

چند بے درد قہقہوں اور کچھ روح فرسا شور و غل نے اس کے دماغ کے ساکن تاروں پر مضراب کا کام کیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دیکھا تمام آدمی گھاٹ کی بیدرد لہروں کی جانب دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے بھی نگاہیں ان نگاہوں کی سیدھ میں ڈالیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی جس کے صرف سر پہ پگڑی تھی اپنی بھینس کی دُم پکڑ کر گھاٹ کو عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب وہ اونچی اونچی لہروں کی زد میں تھا۔ اور لہریں اپنے بے درد تھپیڑوں کے ساتھ اسے رہ رہ کر کھینچ رہی

تھیں اور وہ غوطے پر غوطہ کھا رہا تھا۔ جب کبھی لہر کا ایک بیدرد تھپیڑا اس کے جسم پر پڑتا اور وہ تیورا کر غوطہ کھاتا۔ کنارے سے قہقہوں کا ایک غلغلہ بپا ہوتا جو آہستہ آہستہ لہروں کے بے ہنگم شور میں ڈوب جاتا۔ سرندر انسانی ہمدردی کے اس دل گداز مظاہرے کو دیکھکر کانپ اٹھا۔ اس نے خیال کیا اگر وہ بھی لہروں کی زد میں آنے کی کوشش کرتا تو محض چند لمحوں کے لئے ان بیدردانسانوں کی دلچسپی کا مشغلہ بن کر نابود ہو جاتا اور اسے اپنے سینہ میں ان انسانوں کے خلاف ایک بے پناہ جذبۂ نفرت بیدار ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے نفرت سے نگاہیں ان کی جانب سے پھیر لیں۔ اسے قریب ہی گھاس پر اس بستی کا ایک ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا نظر آیا۔ سرندر نے اس سے پوچھا۔

"یہ گھاٹ کا پانی کس وقت تک اُترے گا"

"یہی کوئی آٹھ نو بجے تک"

"تب تو رات پڑ جائے گی" سرندر نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا پانچ بجنے والے تھے۔

"جی"

"تب یہ مسافر پار کس طرح پہنچیں گے۔"

"تب ہم انہیں بازو سے پکڑ کر پار پہنچا دیں گے۔"

"تم اب کیوں نہیں انہیں بازو سے پکڑ کر پار پہنچا دیتے۔"

"اب اگر انہیں ہمراہ لے جائیں تو یہ پاؤں اُکھڑتے ہی اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبیں گے۔"

تم چل کر پار پہنچ سکتے ہو۔"

جی"

"گھاٹ میں پانی کس قدر ہے"

"یہی کوئی کمر کمر تک"

"کمر کمر تک تو اس میں لہریں اٹھ رہی ہیں"

"جی بس یہ لہریں ہی لہریں ہیں۔ ورنہ پانی تو محض گھٹنے گھٹنے تک ہے۔"

"تمام پاٹ میں"

"جی جس راستہ سے اسے پار کیا جا سکتا ہے۔"

"تو اس میں پانی گہرا بھی ہے۔"

"کہیں کہیں"

"کیا تم اسے عبور کر کے مجھے دکھا سکتے ہو۔"

"کیوں نہیں۔ کیا آپ کو جلدی پار پہنچنا ہے۔"

"ہاں۔"

وہ آدمی سرندر کے کہنے پر گھاٹ کے پانی کو ترچھا چیرتا ہوا گھاٹ کے وسط تک پہنچ گیا۔ یہاں لہروں کا زور کچھ کم تھا۔ لیکن اس کے آگے پھر لہریں اپنی پوری تندی سے جا رہی تھیں۔ اس آدمی نے پلٹ کر سرندر کی جانب دیکھا تو سرندر نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"ٹھہرو۔ میں آیا۔"

چند آدمی حیرت سے سرندر کی جانب دیکھنے لگے۔ ایک نے چُپ نہ رہ سکتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہو رہے ہو۔"

لیکن سرندر نے اس کی بات پر کان دھرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس نے قمیص و پتلون اتار کر اٹیچی کیس میں رکھی اور صرف انڈرویئر پہن کر

ایک ہاتھ سے اٹیچی کیس سر پر تھام کر پانی میں اتر گیا۔ کچھ دور تو وہ آسانی سے چلتا گیا لیکن جب وہ لہروں کی زد میں پہنچا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ رہا ہے۔ اس نے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن وہ اور زیادہ اکھڑنے لگے۔ معاً اسے سمندر کی لہروں کی یاد آئی۔ ایک دفعہ جب وہ کراچی ہوا بندر پر سمندر کی لہروں میں اترا تھا تو اس کے دوستوں نے اسے بتایا تھا کہ جب لہر آئے اسے پھاند جانا چاہیئے یا ڈبکی لگا دینی چاہیئے۔ یہاں ڈبکی لگانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس لئے اس نے تیزی سے ان لہروں کو پھاندنا شروع کر دیا۔ اس کا سانس پھولنے لگا اور لمحہ بہ لمحہ اپنی ہمت جواب دیتی محسوس ہوئی۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ اس کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں اور وہ لہروں کی زد میں سر ٹکراتا ابھرتا۔ گرتا دریائے جہلم کی گہرائیوں میں جا گرا ہے۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ایک بار اپنی تمام بچی کھچی طاقت کو جمع کر کے اس نے دیوانوں کی سی شدت کے ساتھ اس آدمی کی طرف پھاندنا شروع کر دیا۔ دوسرے ہی لمحہ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ وہ آدمی کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس نے ایک آخری ریلا اور لگایا۔ اور اب اس کا ہاتھ اس آدمی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ میں تھا۔

"بابو جی آپ نے تو کمال کر دیا۔" اس آدمی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا لیکن سرندر اس قدر ہانپ رہا تھا کہ وہ کافی عرصہ اُسے کچھ جواب نہ دے سکا کتنی دیر گھاٹ کے عین وسط میں ٹھہرنے کے بعد سرندر نے اس سے آگے بڑھنے کے لئے کہا۔

"نہ بابو جی۔ اب میں آپ کو اکیلا نہیں آنے دوں گا۔"

"پھر"

"آپ میرا ہاتھ تھام لیں۔"

کوئی اتنا ہی یا اس سے کم و بیش راستہ اور تھا۔ سرندر نے اس آدمی کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں پھر لہروں میں کود پڑے۔ لیکن اب کی دفعہ سرندر کو اتنی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ جو اس نے اکیلے میں محسوس کی تھی اور وہ معمولی کوشش کے ساتھ کودتا پھاندتا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے آدمی کا شکریہ ادا کیا اور بٹوے میں سے ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر بھی گرما دی۔ پھر اٹیچی کیس سے سوٹ نکال کر پہنا اور اسی طرح جرابوں کو پتلون پر چڑھا کر آگے بڑھ نکلا۔

دھبے

مصنفہ پرویز

جس طرح بھدی سے بھدی عورت میں کہیں نہ کہیں حسن موجود ہوتا ہے اس طرح زندگی کے تلخ سے تلخ واقعات میں بھی کوئی نہ کوئی دل چسپی کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔ "دھبے" زندگی کے ایسے ہی تلخ واقعات کا مجموعہ ہیں۔ جنہیں خلوت میں بھی سوچ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا مطالعہ کس قدر دلچسپ ہوگا۔

نواں باب

سگھوئی میں قدم رکھتے وقت سرندر کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا دیکھیں دمنتی اس سے کس طرح پیش آتی ہے۔ کیا اب بھی اس کی نگاہوں میں ویسی ہی چمک پیدا ہو جائیگی جو اسے ملکوال میں دیکھکر پیدا ہوئی تھی یا کیا ..... لیکن تصویر کے دوسرے پہلو کی جانب دیکھنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ اس نے خیال کیا کہ ملکوال سے یوں ایکا ایکی چلے آنے میں اس نے کچھ مردانگی کا ثبوت نہ دیا تھا۔ وہ تو صریحاً بزدلی تھی کہ وہ اپنے تصور کے حسرت ناک مآل کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن اب پھر اسی آگ میں خود کو جھونکنا! کیا وہ حماقت تو نہیں کر رہا اور ایک دفعہ اس کے پاؤں بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ واپس لوٹ جائے لیکن گھمان کی تند موجوں کا تصور کرتے ہی وہ کانپ اٹھا اور جلدی سے آگے بڑھ نکلا۔ گلی میں قدم رکھتے ہی کسی نے اشتیاق آمیز الفاظ سے اس کا استقبال کیا

"نمستے جی"

اور سریندر نے اس جانب پلٹ کر دیکھا۔ پہلے ہی مکان کی ڈیوڑھی میں سڑ قد کملا پیڑھی کے قریب کھڑی تھی۔ وہ شاید پیڑھی پر بیٹھی چادر پر پتیاں کاڑھ رہی تھی اور سریندر کو دیکھتے ہی چادر ایک جانب رکھکر کھڑی ہو گئی تھی۔ سریندر کو کملا کے ملنے کی قطعاً امید نہ تھی اس لیئے وہ کوشش کرنے پر بھی اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا۔

"تم کملا!" وہ حیران ہوتے ہوئے بڑبڑایا

"جی"

"خیریت سے تو ہو"

"مہربانی ہے"

"کس کی" سریندر نے اپنی مخصوص شوخی سے پوچھا۔

"بیٹھیے گا،" کملا نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا

"آتا ہوں ــــ ذرا آگے مل آؤں"

چند ہی قدم آگے بڑھنے پر اسے اپنی ساس اپنی جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے جھک کر اسے پیری پونہ کہا اور اس کی ساس نے شفقت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر وہ بھی اسکے ساتھ لوٹ پڑی۔ گھر پہنچتے ہی وہ عورتوں اور مردوں کے اژدہام میں گھر گیا۔ اس نے خیال کیا کہ اسی اژدہام میں کہیں اس کی رفیقۂ حیات بھی گھری کھڑی ہو گی۔ کیونکہ ضروری ہے کہ وہ میکے کے اپنی والدہ کے ہمراہ یہاں آئی ہو۔ اس نے ایک تیز نگاہ چہار جانب ڈالی لیکن اپنی رفیقۂ حیات کے بجائے اسے ایک کونہ میں دمنتی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ وہ لپک کر دمنتی کے پاس پہنچ گیا۔

"نمستے جی!" سریندر نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچنے کیلئے کہا

"نمستے" دمنتی نے سریندر کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ پھر سریندر کو دیکھکر

اشتیاق آمیز لہجہ میں بولی :-

" آپ آگئے ؟ "

" دیکھ لیجئے ! " سرندر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا

" بیٹھئے گا "

" کہاں ؟ "

" سر آنکھوں پر

یہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے "

" پھر "

" دل میں بٹھا لیجئے " سرندر نے سرگوشی کے سے انداز سے کہا ۔

دمنتی نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن سب کو اپنے رنگ میں مست دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

دل تو مدت سے آپ کی آرزو میں تڑپ رہا ہے "

" سچ " سرندر نے مسرور ہوتے ہوئے پوچھا

" اب اپنے دل سے پوچھ لیجئے ۔ "

" گھان کی حالت معلوم ہے کیا ہے "

" نہیں تو "

" بس ایک میل میں پھیلی ہوئی ہے ۔ اسے عبور کر کے آیا ہوں "

" ہائے میں مرگئی " دمنتی نے گھبرا کر کہا ۔ " اگر دشمنوں کو کچھ ہو جاتا "

" اب اپنے مرنے والے لفظ تو لو واپس اور دشمن صحیح سلامت ہیں ۔ "

" آپ تو میری جان ہیں " دمنتی نے آہستہ سے کہا ۔ پھر ایک لمحہ بعد اضافہ کیا ۔

" میرا دل اب تک دھک دھک کر رہا ہے "

"دیکھوں تو" سرندر نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور دمنتی جھینپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بیٹھئے میں آپ کے لئے پانی بنالاؤں"۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحہ بعد دمنتی ایک پلیٹ میں کچھ مٹھائی اور ایک گلاس سکنجبین لے کر آگئی۔ سرندر کے سامنے دونوں چیزیں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"پیجئے"

"اور آپ"

"میں تو ابھی ابھی پی چکی ہوں"

"یہ عورتوں والا جھوٹ"

اور دمنتی باوجود ضبط کے مسکرا دی اور مسکراتے ہی مسکراتے آنکھوں سے کچھ اس منت آمیز انداز میں سرندر کی جانب دیکھا کہ سرندر نے مجبور ہو کر گلاس ہاتھ میں لے لیا۔ پھر بھی اس نے دمنتی کو پلیٹ میں سے ایک گلاب جامن کھانے کے لئے مجبور کر دیا۔

باتوں ہی باتوں میں سرندر کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی رفیقۂ حیات طبیعت کی ناسازی کے باعث شادی میں نہیں آسکی۔ اس نے تسکین کا ایک گہرا سانس لیا اور بقایا سکنجبین ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل گیا۔

۲

اس رات خوش قسمتی سے گلی کا گیس باوجود کوشش کے روشن نہ ہو سکا اور گو گھر کے اندر چراغاں ہو رہا تھا لیکن باہر شب دیجور کا عالم تھا۔ اماوس کی رات یوں بھی

تاریک ہوتی ہے۔ اسیر بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں نے سرِشام سے نگھوتی کے اوپر منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ رات کے نو بجے تھے اور ابھی کھانا ملنے میں کم از کم ایک گھنٹہ کی دیر نظر آتی تھی۔ اس لئے گلی میں جگہ بہ جگہ چارپائیوں پر آدمیوں کی ٹولیاں بکھری تھیں۔ سرندر نے نگاہیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو اسے ایک جانب دو چارپائیوں پر دمنتی اور کملا آمنے سامنے بیٹھی باتیں کرتی نظر آئیں۔ وہ سیدھا وہاں پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی دمنتی ایک جانب سرک گئی اور سرندر خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"پھر آپ آئے نہیں" کملا نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

"آپ تو یہاں بیٹھی ہیں جاتا کہاں" سرندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ایک اچٹتی نگاہ کملا کے چہرہ پر ڈالی جو گھومتی ہوئی دمنتی کے سراپا پر پھیل گئی۔ سرندر نے دیکھا دمنتی کا ایک ہاتھ بالکل اس کے پہلو کے قریب پڑا ہے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سرکا کر دمنتی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور پھر سے کملا سے باتیں کرنے لگا۔ سرندر نے رات کی گھٹا ٹوپ تاریکی کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ کملا سے باتیں کرتا تو دمنتی کے ہاتھ کو آہستہ آہستہ دباتا جاتا اور دمنتی کی جانب رخ کرتا تو کملا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ کملا مقابل کی چارپائی پر ٹانگیں نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس لئے گاہ گاہ سرندر کا بایاں ہاتھ اس کی ٹانگوں کو سہلانے لگتا۔ کچھ ہی دیر بعد سرندر چارپائی پر لیٹ گیا۔ دمنتی اور بھی سرک کر پیچھے ہٹ گئی لیکن اس کا ہاتھ سرندر کے ہاتھ میں رہا۔ اب سرندر نے جرات کر کے پاؤں کے انگوٹھے سے دمنتی کے پاؤں کو سہلانا شروع کر دیا۔ سرندر کی جسارتیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئیں اب یہ موقعہ پا کر کملا اور دمنتی کی رانوں میں چٹکیاں بھی لینے لگا۔ لیکن لطف یہ تھا کہ ہر ایک یہی سمجھ رہی تھی کہ سرندر کی نگاہ التفات صرف اس کے لئے ہے اور اس کی یہ شوخیاں محض اس کی ذات کے لئے مخصوص ہیں کتنی ہی دیر وہ دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے ہوئے چہک چہک کر باتیں کرتا رہا

کبھی وہ کملا سے طنزیہ انداز میں گفتگو کرنے لگتا اور دمنتی سے التفات کی باتیں شروع کر دیتا تو کملا یہ سمجھتی کہ یہ محض دمنتی کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لئے ہے لیکن ایک ہی لمحہ بعد وہ کملا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوتا اور دمنتی کی ٹانگوں پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہا ہوتا تو دمنتی خیال کرتی سرندر کمال ہوشیاری سے کملا کو فریب دے رہا ہے اور وہ بھی گاہ گاہ اپنے جذبہ کے اظہار کے لئے سرندر کے ہاتھ کو آہستہ سے دبا دیتی۔ پھر کسی نے کملا کو آواز دی اور وہ حسرت بھری نظروں سے سرندر کی جانب دیکھتی ہوئی ایک بار سرندر کے ہاتھ کو زور سے دبا کر اٹھ گئی۔ اور سرندر نے دمنتی کی جانب رخ کیا۔

"آپ نے کملا کو خوب بنایا" دمنتی نے مسکراتے ہوئے کہا

"اور کیا کرتا۔" سرندر نے شوخی سے دمنتی کے ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے کہا

"رات آپ یہاں نہ سوئیے گا" دمنتی نے آہستہ سے کہا

"پھر"

"ادھر میری ماسی کا گھر ہے وہاں سوئیں گے"

"اچھا"

"یہاں تو بھیڑ ہوگی وہاں خوب مزے سے باتیں کریں گے۔" دمنتی نے سرور انداز میں اضافہ کیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے" سرندر نے اس کی مسرت میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

اتنے میں کملا پھر آگئی اور اس کے چند لمحہ بعد کھانے کا بلاوا آیا۔ اس لئے یہ باتوں کا سلسلہ یہیں ختم ہوگیا۔

لیکن کھانا کھانے کے عین بعد سرندر کی ساس اس کے پاس آگئی اور کہنے لگی

"آؤ چلیں"

"کہاں" سرندر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا

"ادھر اس مکان میں"

"وہاں کیا ہے"

"وہاں تمہارے سونے کا انتظام کیا ہے"۔

"وہ کیا دمنتی کی ماسی کا گھر ہے"۔

"نہیں وہ تو میری بہن کا گھر ہے۔ دمنتی کی ماسی کا گھر تو اس طرف ہے"

"لیکن میں نے تو دمنتی کی ماسی کے گھر سونے کا انتظام کیا ہے"۔

"وہ کچھ اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہ مکان بالکل نیا بنا ہے"۔

"لیکن میں نے تو . . . ."

"یہاں اکیلے مزے سے سو سکو گے۔ وہاں جا کر کیا لو گے"

"پھر بھی . . . ."

"تھکے ہوئے ہو۔ اب چل کر سو جاؤ۔ باتیں کرنے کے لئے کل دن نکلے گا ہی"

"چلو" اور سرندر اور کوئی بہانہ نہ سوچ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اپنی بھابی کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ اس کی ساس اپنی بیٹی کے پاس کیوں نہ رہ گئی۔ اسے کیا ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو بیمار چھوڑ کر یہاں ضرور پہنچے اور اگر اسے یہاں آنا ہی تھا تو میرے سر پر سوار ہونا کیا ضرور تھا۔ میں اچھا برا جہاں بھی سو جاتا۔ اس سے اس کو کیا مطلب۔ اور ایک بار اس نے دانت پیس کر اپنی ساس کی طرف دیکھا لیکن پھر اپنی بے بسی پر ہونٹ کاٹ کر سر جھکا لیا۔

اس رات نرم و ملائم بستر کی ریشمی چادریں بھی سرندر کو خوش نہ کر سکیں وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا۔ یہ کیا زبردستی ہے۔

کہ میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے یہاں سونا پڑے گا۔ اور پھر اس کی نگاہوں کے سامنے دمنتی کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں پھر جاتیں جو مردوں کے مجمع میں اسے تلاش کر رہی ہوتیں۔ اور وہ خیال کرتا کہ وہ اس قدر بزدل ہے کہ ایک حسین عورت کے چہرہ پر مظلومیت کے نشان دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے منہ پر زور زور سے چانٹے رسید کرے۔ ایکبار اس نے چاہا بھی کہ کوٹھے کے اوپر سے ہی چھلانگ لگا کر گلی میں پہنچ جائے اور دمنتی کی ماسی کا گھر پوچھتا پوچھتا اس حور طلعت ماہ پارہ کے پہلو میں جا پہنچے۔ پھر ایک مبہم سا خوف اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتا۔ ایک بار تو وہ چھت کی منڈیر تک پہنچکر لوٹا۔ اس نے خیال کیا اگر وہ دروازہ کی محراب کے اوپر بڑھی ہوئی لکڑی پر پاؤں رکھ کر دیوار کا سہارا لیتا ہوا روشندان کی سلاخوں کو پکڑ لے اور پھر بائیں ہاتھ سے اس لکڑی کو تھام کر دائیں ہاتھ سے روشندان کی بڑھی ہوئی اینٹوں کا سہارا لیکر نیچے لٹک جائے تو وہ بڑی آسانی سے کھڑکی تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر ایک معمولی سی چھلانگ اور وہ گلی میں ہوگا اور اس کا دل چاہا کہ وہ ایسا کر گزرے لیکن یہ خیال کر کے کہ اگر اسے کوئی اس حالت میں دیکھ لے تو کیا سمجھے گا۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر بستر کی ریشمی چادریں اسے کانٹوں پر لوٹاتیں اور وہ کروٹیں لیتے اور آہیں بھرتے مرجھائے ہوئے ستاروں کی طرف دیکھتا کہ جن کی روشنی کو ہلکے ہلکے بادلوں کی غمناک چادر نے پژمردہ بنا رکھا تھا اور وہ خیال کرتا کہ ان ستاروں پر بھی اس کی آرزوؤں کی طرح غمناک بادل چھا رہے ہیں۔ ایسے غمناک بادل کہ جنہیں ہٹا دینا نہ ان کے بس کی بات ہے اور نہ میرے۔ اور وہ پیچ وتاب کھا کر اپنا سر جھٹک دیتا۔ لیکن ایک لمحہ بعد وہ پھر تصور ہی تصور میں دمنتی کی آغوش میں ہوتا۔ یوں ہی بستر پر کروٹیں لیتے لیتے اس نے چار بجا دیئے۔ پھر نہ معلوم کیوں اور کیسے اُسے نیند نے تھپکیاں دے کر سُلا دیا۔

اسے جب ہوش آیا تو دھوپ اس کے چہرہ سے کھیل رہی تھی اور کوئی آہستہ آہستہ اس کا شانہ ہلا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر اس جانب دیکھا تو اپنی ساس کو کھڑا پایا اس کی ساس نے اسے جاگتا دیکھکر کہا۔

"اگر دمنتی کی ماسی کے گھر جاتے تو ایک لمحہ بھی نہ سو سکتے"۔

سرندر نے دل ہی دل میں خیال کیا کہ اب اسے کون بتائے کہ یہاں تمام رات کانٹوں پر بسر ہوئی ہے اور یہ سب اس کی اس مہربانی کا نتیجہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ اسے ممنون احسان بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس نے با دل ناخواستہ مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہوں"

"اب اٹھو اور نہا دھو لو"

"جی نہا لیتا ہوں"

سرندر کی ساس تو یہ فرمان جاری کر کے چلی گئی اور سرندر بستر پر بیٹھ کر زیر لب گنگنانے لگا ؎

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

اور ایک تلخ تبسم اس کے لبوں پر پھوٹ نکلا۔ وہ بے نیازی سے پلنگ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے شادی والے گھر کی جانب چل دیا سب سے پہلے اسے دمنتی ہی ملی۔ سرندر نے ندامت سے سر جھکا لیا اور مری ہوئی آواز میں کہا۔

"میں شرمندہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"آپ کی ساس آپ کو گھسیٹ لے گئی تھی"۔ دمنتی نے ایک پھیکی مسکراہٹ چہرہ پر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کو معلوم ہے۔"

"ہاں، میں آپ کو بلانے آئی تھی لیکن آپ کی ساس پہلے ہی آپ کے سر پر نازل تھی۔"

"میں ڈرتا تھا کہیں آپ مجھسے ...."

"آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ اپنی مرضی سے بھی نہ آتے تب بھی آپ مالک تھے" اور سرندر کا دل چاہا کہ ان آنے جانے والوں کی موجودگی کو نظرانداز کر کے اسی لمحہ دمنتی سے لپٹ جائے۔ اس نے ایک محبوب نگاہ دمنتی کے چہرہ پر ڈالی اور مسکرا کر کہنے لگا۔

"میری بدقسمتی تھی کہ آپ سے باتوں کا یہ موقعہ کھو گیا۔"

"یا میری۔" دمنتی نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"یا ہم دونوں کی۔" سرندر نے اصلاح کی اور پھر دونوں مسکرا دیئے۔ سرندر اظہار بدقسمتی کے اس نئے طریقہ کو دیکھکر دل ہی دل میں چیخ اٹھا۔ اتنے میں ایک جانب سے کملا بھی جھکتی ہوئی پہنچ گئی۔ سرندر نے اسے دیکھتے ہی کہا

"کھل گئی نیند آپ کی"

"میں تو نہا بھی چکی" کملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تب تو ہم پیچھے رہ گئے"

"آپ بھی نہا لیجئے۔"

"نہائیں کیسے۔ نہ صابن ہے، نہ تیل نہ تولیہ"

"میں لائی۔ میں لائی" کملا اور دمنتی نے بیک وقت کہا اور دونوں تیزی سے اپنے اپنے گھروں کی جانب ہوا ہوگئیں۔ سرندر ان کے اس ایکدوسرے پر سبقت لیجانے کے خیال سے دل ہی دل میں جھوم اٹھا۔ ایک ہی لمحہ بعد کملا تینوں چیزیں لے کر

پہنچ گئی اور دوسرے لمحہ دمنتی بھی۔ سرندر نے کملا کے ہاتھ سے تینوں چیزیں لے لیں اس کے ساتھ ہی اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ دمنتی اس کی اس حرکت پر مایوس سی ہوگئی ہے۔ اس نے دمنتی کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا

"آپ سے کل"

اور پھر کچھ اس انداز سے دمنتی کو آنکھوں کی جنبش سے اشارہ کیا کہ دمنتی خوش ہوگئی اور سمجھنے لگی کہ سرندر محض کملا کے سرخ ہونے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ دمنتی کی جانب سے رخ پھیرتے ہوئے جب اس نے کملا کی جانب دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ کملا کا انگ انگ مسرت سے پھڑک رہا ہے۔ وہ خود بھی شوخی سے مسکراتا ہوا نہانے کے لئے مندر کے کنویں پر چلا گیا۔

سرندر نہا کر جب واپس لوٹا تو کملا اپنے مکان کے دروازہ پر کھڑی تھی۔ سرندر کو دیکھتے ہی وہ جھٹ سے اندر چلی گئی۔ سرندر اس کے اس ایکا ایکی اندر چلے جانے کا مدعا نہ سمجھ سکا۔ اس نے دروازہ میں کھڑے ہو کر پکارا۔

"کملا"

لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ اس نے ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر پکارا

"کملا"

لیکن اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اندرونی دروازہ کے قریب سے پکارا۔

"کملا"

اور کسی کی رس بھری آواز سنائی دی

"آجائیے۔"

سرندر نے جرأت سے مکان میں قدم رکھا۔ اس نے دیکھا کہ کملا آئینہ کے سامنے

کھڑی بالوں کو آراستہ کر رہی ہے۔ سرندر نے صابن وغیرہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا
"یہ لیجئے صابن۔ تیل۔ تولیہ"

"آیئے نا" کملا نے ایک دم پلٹ کر سرندر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور سرندر نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی مستی جھوم رہی ہے۔ سرندر نے صابن تیل وغیرہ میز پر رکھتے ہوئے کہا "اب پھر آؤں گا" لیکن یہ الفاظ کہہ چکنے کے بعد وہ خود بھی حیران تھا کہ اس نے یہ الفاظ کیسے کہہ دیئے۔ اس نے بیقرار ہو کر نگاہیں کملا کے چہرہ پر ڈالیں۔ اس کے ساتھ ہی کملا نے اپنی تمام ساحرانہ قوت کو آنکھوں میں جمع کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھئے تو سہی"

لیکن سرندر پر جیسے کسی نے فسوں کر دیا تھا۔ ایک بار پھر بیاختگی سے وہی لفظ اس کے منہ سے نکل گئے

"اب پھر آؤں گا"

وہ حیران تھا کہ ایکا ایکی اس کی زبان اس کے قابو سے کس طرح نکل گئی ہے کہ وہ بیٹھنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی کہہ رہا ہے۔ "اب پھر آؤں گا۔"

"بیٹھئے گا۔" ایک بار پھر کسی نے نہایت التجا آمیز لہجہ میں کہا

اور سرندر کملا کے اس منت آمیز لہجہ کو سن کر کانپ اٹھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے نہایت بیدردی سے اس کے ننگے جسم پر اپنی پوری طاقت سے کوڑا مارا ہے وہ شدت درد سے تلملا اٹھا اور تیسری دفعہ بے ساختگی سے یہ کہتا ہوا کہ "پھر آؤں گا" کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ گھر سے باہر نکلتے ہی سب فسوں یک لخت ہوا ہو گیا۔ سرندر نے محسوس کیا کہ وہ پرلے درجہ کا احمق ہے کہ یوں بار بار موقعہ پانے کے باوجود ہمیشہ ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے اور اسے اپنی حماقت پر اس قدر غصہ آیا کہ اس

نے گلی ہی میں اپنی چھاتی پر زور سے مکا مارا اور قریب ہی پڑی ہوئی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ اسی طرح چارپائی پر اوندھے منہ لیٹا رہا۔ حتیٰ کہ کسی نے اس کے پاس لیٹتے ہوئے کہا

"آپ یہاں کیوں لیٹ گئے"

سرندر نے پلٹ کر دیکھا تو کملا اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اُسے اتنی حیرت زندگی میں شاید ہی کبھی ہوئی ہوگی۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ ایسا مایوس کن جواب پانے کے باوجود کملا اس کے پاس چلی آئے گی۔ اس نے بوکھلاتے ہوئے کہا

"میں تو سمجھتا تھا کہ ...."

"اب میں آپ کے پاس کبھی نہ آؤنگی" کملا نے فقرہ مکمل کر لیا۔

"جی۔ یہ جس اپنے حضور میں اس قدر گستاخی برداشت کر لیگا اس کا مجھے یقین نہ تھا۔"

"تو پھر آپ نے مجھے نہیں سمجھا"

"شاید"

"لیکن میں آپ کو سمجھ گئی۔"

"کیا"

"یہی آپ کی اس قربانی کو"

"میری قربانی کو"

"جی۔ جو آپ نے میری درخواست کو رد کرنے میں کی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ آپ کے دل میں طوفان اٹھ رہا ہے لیکن آپ نے انتہائی محبت ہونے پر بھی میری عصمت کو داغدار کرنا پسند نہ کیا۔"

"کملا"

آپ سچے موتی ہیں"

"کملا"

"جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاؤں چوم لوں"

"کملا" اور سرندر نے تڑپ کر کملا کے آنچل میں منہ چھپا لیا۔ اُسے ضمیر کی اتنی ملامت آجتک برداشت نہ کرنی پڑی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ کملا کو اپنی ذہنی کیفیت من و عن سنا دے لیکن جیسے کسی نے اس کی زبان سی دی تھی۔ اس کی ہمت اس بھولی بھالی لڑکی کے معصوم خیالات کو تباہ کرنیکی جرأت نہ کر سکی اور وہ دل ہی دل میں تلملا کر خاموش ہو گیا۔

---

(۳)

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سرندر چند آدمیوں کے ساتھ تاش کھیلنے چلا گیا۔ کوئی چار بجے کے قریب جب وہ واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ دمنتی گلی میں چارپائی پر بیٹھی ایک سرخ دوپٹہ پر گوٹا ٹانک رہی ہے۔ سرندر کے قریب پہنچتے ہی اس نے دوپٹہ سے نگاہیں ہٹا کر سرندر کی جانب دیکھا اور اس کے ہاتھ میں تاش دیکھکر اس نے جھپٹ کر تاش چھین لی۔

"یہ تاش آپ کو ہمارے پاس بیٹھنے ہی نہیں دیتی"۔ دمنتی نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اسے ابھی ٹرنک میں رکھ کر تالا لگا تی ہوں" کہتے کہتے وہ کھلکھلاتی ہوئی اپنے مکان کی جانب بھاگ گئی۔ سرندر بھی مسکرا کر وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک ہی لمحہ بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں تاش کے بجائے مٹھائی کی پلیٹ تھی۔ اس نے سرندر کے قریب پہنچتے ہوئے کہا

"لو یہ کھاؤ" اور پھر خود بھی مسکرا کر اس کے قریب بیٹھ گئی لیکن ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ گھر کے اندر سے اُسے کسی نے بلایا۔ اس نے پلٹ کر اس جانب دیکھا اور

پھر منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی دوپٹہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ ادھر سرندر پلیٹ سے مٹھائی کے دانے اچھال اچھال کر کھانے لگا۔ معاً اس کی نگاہ ایک بوٹے سے قد کی نکھرے ہوئے گندمی رنگ کے دلکش خدوخال و سڈول اعضا والی دوشیزہ پر پڑی جو مستانہ روی سے گلی میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ پیش آمدہ خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی اس کے قریب پہنچی تو اس نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی بھی اسے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ کچھ آگے بڑھ کر وہ دوشیزہ رکی۔ اس نے پلٹ کر ایک بار پھر سرندر کی جانب دیکھا پھر اعتماد انداز سے قدم بڑھاتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ سرندر ابھی اس کی جرأت پر حیران ہی تھا کہ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

سرندر نے ایک بار پھر ایک بھرپور نگاہ اس دوشیزہ کے سراپا پر ڈالی لیکن دماغ پر بہت زور دینے کے باوجود وہ اس خوش ادا لڑکی کو اپنے تصور میں کہیں بھی تعین نہ کر سکا۔ اس نے اپنے چہرہ پر مایوسی کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاید نہیں"

"میں سمتری ہوں" اس دوشیزہ نے کمال معصومیت سے کہا لیکن پھر بھی سرندر اس معصوم دوشیزہ کو بیتے ہوئے دنوں کی تصویریں میں کوئی موزوں جگہ دینے سے قاصر رہا۔ اسے خیال نہ آتا تھا کہ اس نام کی کسی لڑکی کا اس کی ہنگامہ خیز زندگی میں کبھی کہیں دخل ہوا ہو۔ اس نے دوبارہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا میرا حافظہ کچھ کام نہیں کر رہا۔"

سمتری سرندر کے اس جواب پر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا

"تو پھر جانے دیجئے۔"

"نہیں نہیں" سرندر نے اس کی مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا "آپ ذرا واضح طور پر بتائیں۔ میں سمجھ جاؤں گا۔ اس طرح اگر آپ چلی جائیں گی تو خود مجھے بیحد پریشانی ہوگی۔"

"آپ کی بھابی راج ہے نا" ستری نے سرندر کی باتوں سے تقویت پاتے ہوئے کہا "میں اس کی ماسی کی لڑکی ہوں۔"

"اوہ — ستری، تم" سرندر نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا "تم اتنی بڑی کب ہوگئیں" اور اس نے تصور میں دیکھا۔ ایک چھوٹی سی نو دس سال لڑکی آستین سے ناک پونچھ رہی ہے اور چپل میں گرمیاں سے املی خریدنے کے لئے پیسہ مانگ رہی ہے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ چھوٹی سی گندی سی لڑکی یہ خوش ادا دوشیزہ ہو سکتی ہے۔ مان لیا کہ سات سال میں اس کا قد اس قدر بڑھ سکتا ہے لیکن وہ بھدی سی ناک یہ لمبی ستواں ناک کیونکر بن سکتی ہے۔ اور ان ہمیشہ دکھنے والی آنکھوں کو ان خوبصورت کٹوروں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر ایک بھرپور نگاہ ستری کے چہرہ پر ڈالی اور خیال کیا کہ قدرت مردوں کی نسبت عورتوں کو حسن دینے میں واقعی فراخ دل واقع ہوئی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔

تم ستری ہو۔ تو اتنا عرصہ پہیلیاں کیوں بوجھ رہی ہیں۔ سیدھا بھاگ کر میرے پاس آجانا تھا۔

"آتو گئی تھی۔ لیکن آپ نے تو پہچانا ہی نہیں" ستری نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔

"جی۔ یہ تو مجھ سے غلطی ہی ہوگئی" سرندر نے مسکرا کر کہا "اب بیٹھ جائیے۔ یا کھڑے رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

اور ساوتری کھٹ سے سرندر کے پہلو میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سرندر نے مٹھائی کی پلیٹ اس کی جانب سرکاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے کھائیے۔"

ستری نے مسکرا کر سرندر کی جانب دیکھا۔ پھر نیچی نگاہیں کئے ہوئے پلیٹ سے برفی کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا

"شکریہ"

اور سرندر اس معصوم سی لڑکی کے اس مہذبانہ طرز گفتگو اور سلیقہ کی دل ہی دل میں تعریف کرنے لگا۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ وہی بے معنی سی۔ بے سروپا باتیں۔ لیکن سرندر محسوس کر رہا تھا کہ اس ننھی سی الھڑ لڑکی کے اعضا میں تناسب و دلکشی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی زبان میں بھی لطافت و شیرینی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم تو بڑی سیانی ہو گئی ہو۔"

"اب لگے آپ مجھے بنانے" ستری نے سرندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر مسکرا کر ایک عجیب سی انداز سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔

وہ رات برات کی ہماہمی میں کٹ گئی اور کوشش کرنے پر بھی سرندر کو دمنتی سے ملنے کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ دولہا میاں تھے کہ سرندر کو ایک پل بھر بھی نظر سے دور کرنے سے گھبراتے تھے۔ شاید وہ ڈرتے تھے کہ اس کی عدم موجودگی میں سالیاں اسے نوچ نوچ کھائیں گی۔

۴

دوسرے دن مندر کے کنوئیں پر نہا آنے کے بعد جب سرندر نے دمنتی سے تاش مانگی تو اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوں۔ ناش گئی"۔

"کہاں"

"اپنے گھر"۔ اور وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی سرندر کا پہلو کتراکر نکل گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ جب وہ واپس لوٹی تو سرندر نے تاڑ لیا کہ اس کے ہاتھ کا ریشمی رومال تاش کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس نے ونتی کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"ذرا یہ رومال تو دکھانا"

"دیکھ تو آپ رہے ہیں"

"جی میں تو ذرا ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیسا ہے"

"ریشمی ہے"

"اب ہم ایک رومال کے لائق بھی نہیں رہے"

"جی نہیں بات یہ ہے کہ یہ رومال کچھ آپ کے لائق نہیں"۔

"مجھے پسند ہے"۔ کہتے کہتے سرندر نے جھپٹ کر ونتی کے ہاتھ سے رومال چھین لیا۔ رومال تو اس کے ہاتھوں میں آگیا۔ لیکن تاش نیچے گر گئی جسے اٹھانے کے لئے دونوں بڑھے۔ لیکن سرندر نے چالاکی سے بائیں پاؤں کی ٹھوکر سے اسے ایک جانب سرکا دیا۔ پھر لپک کر اسے خود اٹھا لیا اور ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ گیا

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد سرندر گلی میں چارپائی پر بیٹھا تھا اور بہت سی لڑکیاں گلی میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہاتھوں میں مہندی رچا رچا کر دلوں میں آگ لگا رہی تھیں۔ اتنے میں ستری بھی آگئی اور ہنستے کھلکھلاتے سرندر کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اور مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"آپ نے مہندی نہیں لگائی"

"کوئی لگا دے تو لگوا لیں"

"یہ بات ہے۔" کہتے کہتے سمتری مسکراتی ہوئی مہندی لینے چلی گئی۔ دو ہی لمحہ بعد جب وہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں مہندی کا بھرا ہوا کٹورا تھا۔ اس نے سرندر کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لائیے ہاتھ۔"

"ہاتھوں پر تو میں صرف ناخنوں پر مہندی لگانے کا قائل ہوں۔"

"لائیے ناخنوں پر ہی لگا دوں" کہتے کہتے سمتری نے سرندر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر نہایت خوبصورتی سے اس کے ناخنوں پر مہندی لگانی شروع کر دی سرندر کو اپنا ہاتھ سمتری کے پتلے پتلے نازک ہاتھوں میں دیتے ہوئے ایک نشہ سا محسوس ہوا۔ اور اس نشے کا خمار رگ رگ میں ساری کرنے کے لئے اس نے آہستگی سے اپنی آنکھیں موندلیں۔ ایک ہاتھ کے ناخنوں پر مہندی لگا چکنے کے بعد جب سمتری نے سرندر کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو بلا کسی تمہید کے کہا۔

"آپ کا ٹیسٹ (taste) بہت اچھا ہے۔"

"یہ کل کا بدلہ لینے لگی ہو" سرندر نے مسکراتے ہوئے کہا

"وہ کیسے"

"میں نے تمہیں سیانی کہا تھا"

"اوہ نہیں" سمتری نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور سرندر نے محسوس کیا کہ سمتری آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ دبا رہی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"دبائے جا دبائے جا" اور زیر لب گنگنانا شروع کر دیا

"ابھی تو میں جوان ہوں . . . . "

ہاتھ کے ناخنوں پہ مہندی لگا چکنے کے بعد سمتری نے کہا "لائیے پاؤں پر بھی لگا دوں۔"

"جی یہ گناہ مجھ سے نہ ہو سکے گا"
"گناہ کیسا؟"
"یہی ان نرم نرم انگلیوں کو اپنے کھردرے پاؤں سے چھونے دینا"
"آج میرے نصیب جاگ لینے دیجئے"
سمندر نے حیرت سے سمتری کی جانب دیکھا۔ پھر ہنس کر کہنے لگا۔
"تم پتھر کی سل تو ہو نہیں کہ میرے پاؤں سے چھو کر اہلیہ بن جاؤ اور نہ ہی میں بھگوان رام ہوں"
"میری نظروں سے دیکھئے"۔ سمتری نے آہستہ سے کہا اور سمندر اس کی نظروں کی جانب دیکھ کر کانپ اٹھا۔ دوسرے ہی لمحہ اس نے چپکے سے پاؤں بڑھا دیئے۔ ناخنوں پر مہندی لگا چکنے کے بعد اس نے پاؤں کے تلوؤں کے عین بیچوں بیچ مہندی لگانی شروع کر دی۔ سمندر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"اب یہ کیا ہونے لگا ہے"
"لگا لوں تو دیکھ لیجئے گا"
اور جب سمتری اپنی نگارش ختم کر چکی تو سمندر کی حیرت نے دیکھا۔ کہ سمتری نے اس کے پاؤں کے تلوؤں پر دل کی شکل بنا دی ہے۔ اس نے متعجب ہوتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا کر دیا سمتری"
"کچھ نہیں ذرا دل کی شکل بنائی"
پاؤں کے نیچے؟
جی آپ کے پاؤں کے نیچے"
لیکن یہ تو روندا جائے گا"

"روندا تو کل سے جا رہا ہے"

"ستری"

"یہی کیا کم ہے کہ آپ روند رہے ہیں"

"ستری" اور سندر نے بوکھلا کر ستری کے چہرہ پر نگاہیں ڈالیں۔ ستری نے ایک لمحہ کیلئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔ اور پھر شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ سندر حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگا۔ یہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی۔ یہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا سے کیا بنا گئی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس سادگی کے پردہ میں یہ پُرکاری بھی پوشیدہ ہے۔ پاؤں کے نیچے دل بنانا۔ یہ اُسے کیسے سوجھی۔ یہ ایک الہڑ دوشیزہ۔ یہ ایک کھل اٹھنے کو بیقرار کونپل۔ یہ ایک نکھر جانے کو مضطرب چاندنی یہ ستری اس سے جگر مراد آبادی کا وہ شعر یاد آیا ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہوگا

اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

اور اس نے خیال کیا۔ جگر مراد آبادی کو یہ شعر لکھنے میں کس قدر دماغ سوزی سے کام لینا پڑا ہوگا۔ لیکن کس سادگی سے ستری نے اس کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور ترجمانی بھی کہاں۔ جگر کے شعر میں جذبات کی یہ سادگی اور بے ساختگی کہاں ہے جو ستری کے ان چند جملوں سے ہویدا ہے۔

"کچھ نہیں ذرا دل کی شکل بنائی ہے"

"پاؤں کے نیچے"

"جی آپ کے پاؤں کے نیچے"

"لیکن یہ تو روندا جائے گا"

"روندا تو کل سے جا رہا ہے"

"سمتری"

"یہی کیا کم ہے کہ آپ روند رہے ہیں۔"

"سمتری" ___ اور اُسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ پاؤں کے جتنے حصے پر مہندی لگی ہوئی ہے وہ آگ پر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اور ان کی تپش کسی نامعلوم برقی طاقت کے ذریعہ اس کے دل کو گرما رہی ہے۔ اس نے بیقرار ہوتے ہوئے کہا۔

"سمتری! میں یہ مہندی دھونے لگا ہوں"

"یہ ظلم نہ کیجئے گا"

"ظلم۔ یہ تو کانٹوں کی طرح میرے دل میں چبھ رہی ہے"

"محبت ایک دائمی خلش کا نام ہے" سمتری نے دبی زبان سے کہا۔ اور سرندر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیران تھا۔ کہ محبت کے متعلق ایک الہڑ سی لڑکی کا نظریہ کس قدر صاف اور واضح ہے۔ کیا محبت ایک دائمی خلش کے بغیر کوئی اور چیز ہے۔ اور اس نے خیال کیا۔ کل وہ واپس شیخوپورہ چلا جائے گا اور سمتری۔ ہاں سمتری شاید یہیں رہ جائے گی۔ اور پھر نہ معلوم زندگی میں کب اور کیسے اس سے ملاقات ہوگی۔ ہوگی بھی شاید یا نہیں۔ اور اس تمام عرصہ میں اس شرمیلی سی معصوم دوشیزہ کی یاد ایک دائمی خلش بن کر اس کے دل میں چبھتی رہے گی۔ ایک ایسی خلش جو اُسے مضطرب اور بیقرار رکھے گی اور آنے والے دنوں کی تلخی کے خیال ہی سے اسکی پیشانی پر پسینہ پھوٹ بہا۔ اس نے آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ اور پھر خاموشی سے پاؤں چارپائی سے باہر لٹکا کر لیٹ گیا۔ اتنے میں ایک جانب سے دمنتی بھی آگئی۔ اس نے سرندر کی قمیص کی پاکٹ میں اپنا رومال دیکھا تو چاہا کہ چپکے سے پشت کی جانب سے ہاتھ بڑھا کر پاکٹ سے رومال کھینچ لے۔ لیکن سرندر

بھی ایک ہی گرگ تھا۔ اس نے جھٹ دمنتی کی نیت کو تاڑ لیا اور اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ دمنتی کانپ اٹھی۔ سرندر مسکرا کر کہنے لگا

"یہ چوری کی عادت کب سے پڑ گئی"!

"پہلی ہی چوری اور پہلا ہی پھانسی"!

"لیکن تمہیں چوری کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا ہی تو رومال تھا۔ مانگ لیتیں تو کیا میں نہ دیتا"۔

"اچھا اب مانگ لیتی ہوں۔ ہاتھ تو چھوڑ دو"۔

"مانگ لو پھر" سرندر نے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مانگ تو رہی ہوں"!

"اس طرح نہیں"

"پھر"

"ہاتھ پسار کر عرض کیجئے کہ جناب سرندر کمار صاحب ہمارا رومال براہ مہربانی واپس لوٹا کر بندی کو ممنون فرمائیے"۔

"اب یہ تو اعدتو مجھ سے ہونے سے رہی۔

"تو پھر رومال بھی ملنے سے رہا"۔

"خود ہی دوگے"۔ اور دمنتی ناز سے منہ بناتی ہوئی ایک جانب چلی گئی۔

دمنتی کے چلے جانے کے بعد سمتری نے کہا

"دے دیجئے بیچاری کا رومال۔ بیچاری کو غش آجائے گا"!

"ایسی غش کھانے والی نہیں"! سرندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا رومال ہوتا تو میں کبھی نہ مانگتی"۔

"جی"

"افسوس کہ میرے پاس اس وقت کوئی اچھا رومال نہیں ورنہ ابھی آپکی نذر کر دیتی"
"میری بدقسمتی ہے"
"ایک چھوٹا سا نیپ کن (چھوٹا رومال) ہے آپ پسند کریں تو۔۔۔"
"آپ کا دیا ہوا ایک تنکا بھی بیش بہا ہوگا۔ یہ تو رومال ہے" کہتے کہتے سرمدر نے سمتری کے ہاتھ سے نیپ کن لے کر آنکھوں سے لگایا اور پھر احتیاط سے ناخنوں کی مہندی سے بچاکر پاکٹ میں ڈال لیا۔
"آپ ابھی چند دن ٹھیریں گے نا" سمتری نے چند لمحہ بعد پوچھا۔
"جی نہیں۔ کل واپس جارہا ہوں"
"اتنی جلدی"
"کیا کروں اور رخصت نہیں ہے"
اور سرمدر نے دیکھا کہ سمتری کے چہرہ پر ایک مبہم سی پریشانی چھا گئی ہے سمتری کی پریشانی نے اُسے بھی کچھ آزردہ کر دیا۔ اور وہ پریشان ہو کر خاموش ہو گیا

۵

رات بھر سرمدر کی ساس کی مہربانیاں سرمدر پہ نازل ہونی شروع ہوئیں اور سرمدر کے نہ نہ کرنے بھی وہ اسے سونے کے لئے اسی گھر میں لے آئی۔ سرمدر کا یہ حال تھا کہ غصہ سے اس کا عضو عضو کپکپا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ساس کو دھکیل کر ایک جانب کر دیتا اور خود بھاگتا ہوا دمنتی کے پاس جا پہنچتا لیکن اس کی ساس سماج کا وہ ہیبتناک دیو تھا جس نے ہزاروں آرزو مند انسانوں کی آرزوئیں پاؤں کے نیچے مسلی ہیں۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا گیا۔ لیکن دل میں اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج خواہ کچھ ہی ہو جائے وہ دیوار پھاند کر

بھی دمنتی کی ماسی کے گھر پہنچ جائے گا۔ اس نے دن میں دمنتی کی ماسی کا گھر دیکھا تھا اور اب وہ آنکھیں بند کرکے بھی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن چھت پر پہنچتے ہی اُسے ایک اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آج وہاں سونے والے تین آدمی اور بھی تھے سرندر نے خیال کیا۔ یہ اگر دو ہوتے تو انھیں منکر نکیر سمجھ لیتا۔ لیکن ان تینوں کو وہ کیا سمجھے۔ کیا وہ یہ خیال کرے کہ اس کی قسمت میں تین کانٹے لکھے ہیں اور اس کا جی چاہا کہ وہ تینوں کی ایک ایک آنکھ پھوڑ دے۔

سرندر کو دیکھتے ہی وہ تینوں آدمی چلا اٹھے "آؤ سرندر" اور پھر ہر ایک اپنی اپنی چارپائی پر اس کے لئے جگہ خالی کرنے لگا۔ سرندر نے ایک مخمور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو نیند آرہی ہے"

"تمہیں سونے کون دے گا" ایک نے شوخی سے کہا "نکالو تاش"

"آپ تاش لے لیجئے۔ مجھے نیند آرہی ہے" سرندر نے تاش نکال کر اسکی جانب پھینکتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی بات" اور ایک آدمی اُسے بازو سے پکڑ کر چارپائی تک لے آیا۔ سرندر سے اب انکار کرتے نہ بنی لیکن اس نے دل میں ارادہ کر لیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ کھیل کر اٹھ جائے گا۔ لیکن جب تاش کھیلنی شروع ہوئی تو اسکی تمام مصلحت بینی کے باوجود رات کے دو بج گئے اور جب وہ بستر پر پہنچا تو اسقدر آزردہ اور رنجور تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ سر ٹکرا ٹکرا کر پھوڑ لے۔ ایک دو بار اس نے اپنے سر کو اپنی چارپائی کے پائے سے آہستہ آہستہ ٹپکا بھی لیکن سر کا لکڑی سے مقابلہ ہی کیا۔ اس نے سر کو تکیہ پر رکھ لیا اور پھر نا معلوم اُسے نیند کیوں آگئی۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس کا دل غصہ سے تلملا رہا تھا۔ اسکا جی چاہتا تھا

کہ جو بھی اس کے سامنے آئے اس سے دست و گریباں ہو جائے لیکن بدقسمتی سے سب سے پہلے اس کے سامنے اسکی ساس آئی اور وہ آزردہ ہونے پر بھی صرف دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے اپنی ساس سے کہا

"میرے لئے سواری کا انتظام کروا دیجئے"۔

"کیا ابھی جاؤ گے؟"

"جی"

"اس وقت تو کوئی تانگہ نہ مل سکے گا"۔

"تو پھر گھوڑے کا انتظام کروا دیجئے"۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے"۔

اس کی ساس چلی گئی تو اس نے بیزاری سے ایک لمبی انگڑائی لی اور پھر نہانے کے لئے چلا گیا۔ اس دن اس نے صابن۔ تیل۔ تولیہ مانگنا بھی گوارا نہ کیا۔ بات یہ بھی کہ اس میں دمنتی اور کملا کے مقابل ہونے کی جرأت نہ تھی وہ اس کھانے کے قریب جانے سے ڈرتا تھا۔ جسے چھونے کی اجازت نہ ہو۔ وہ سوچتا اس صبر آزما ماحول میں انکے مقابل ہونے سے فائدہ۔ یہی نا کہ حسرت زدہ دل کو اور بھی حسرتوں سے لبریز کر لیا جائے یہ حسرتیں تمام عمر اس کا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ پھر وہ خود ہی انکی تلاش کیوں کرے۔

وہ کتنی ہی دیر نہاتا رہا حتیٰ کہ اس گرمی میں بھی اسکا بدن ٹھٹھرنے لگا اور پھر وہ کپڑے پہن کر آہستہ آہستہ گھر کی جانب چل دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس قدر دیر ممکن ہو سکے کرے تاکہ گھر پہنچتے ہی اسے گھوڑا تیار ملے۔ لیکن گھر پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ گھوڑا دو بجے سے پہلے نہ مل سکے گا۔ وہ مایوس ہو کر ایک کمرہ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور شاید رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اُسے لیٹتے ہی نیند آگئی۔

کوئی بارہ بجے کے قریب وہ بیدار ہوا۔ کھانا کھایا اور سب کی نظریں بچا کر

بنواڑی کی دکان پر چلا گیا۔ پان کھایا اور کتنی ہی دیر وہاں گپّیں ہانکتا رہا۔ وہ جب واپس لوٹا تو ٹھیک دو بج رہے تھے۔ اور گھوڑا گلی میں تیار کھڑا تھا۔ وہ اپنا اٹیچی کیس اٹھالایا۔ اتنے میں دمنتی، کملا اور سمتری بھی آگئیں۔ انھیں دیکھ کر سرندر کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کو انگاروں پر رکھ دیا ہے۔ وہ ایک ایک سے علیحدہ علیحدہ ملنے سے گھبرا رہا تھا۔ اور یہاں تینوں اکٹھی تھیں۔ اور سب کی سب اس سے علیحدہ دو دو باتیں کہنے کی متمنی۔ اسے اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہوا۔ اور اس نے خیال کیا شاید وہ ان سب سے ایک بات بھی نہ کرسکے گا۔ اس نے روکھے گلے سے کہا۔

"بائی"

"بائی" دمنتی نے کہا اور اپنے گھر کی جانب چلدی۔

"بائی" کملا نے کہا اور اپنے گھر کی جانب بھاگ گئی۔

"بائی" سمتری نے کہا اور مایوسی کے انداز میں سرندر کے قریب ٹمنے جاکر آہستہ سے کہا "کاش کہ میرا گھر قریب ہوتا"!

سرندر نے ساوتری کی جانب رُخ کرتے ہوئے اسی طرح آہستگی سے جواب دیا۔

"آپ یہیں کھڑی رہیئے یہی بہت ہے۔"

اتنے میں دمنتی سکنجبین کا گلاس لے آئی۔ سرندر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا ہی تھا کہ کملا بھی آپہنچی اور سرندر کو دمنتی کے ہاتھ سے گلاس لیتا دیکھ کر مایوس ہوکر واپس لوٹنے لگی۔ لیکن سرندر نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بھی گلاس لے لیا۔ اور یکے بعد دیگرے دونوں چڑھا گیا۔ سمتری نے قریب سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"میں ہی بدقسمت رہ گئی"!

سرندر نے دونوں کے گلاس لوٹاتے ہوئے آہستہ سے سمتری کو جواب دیا

"آپ کا شربتِ دیدار ہی کافی ہے۔"

اور سمندری نے شرما کر گردن جھکا لی۔

ساس اور کئی بڑی بوڑھیوں کی دعائیں اُسے گالیوں سے بھی زیادہ بری محسوس ہوئیں۔ اور ان کے دئیے ہوئے اس کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے روپے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے انہیں پاکٹ میں ڈال لیا اور پھر لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سب سے جدا ہوتے وقت اپنی مایوسیوں کا تصور کرتے ہوئے اس کی نگاہیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے سب کو الوداع کہا۔ اور گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا جہلم کی جانب چل دیا۔ چلتے چلتے اس نے سُنا کہ ایک بوڑھی عورت اس کی ساس سے کہہ رہی ہے۔

"بڑا ہی محبتی ر محبت کرنے والا لڑکا ہے۔

اور سمندر کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ بوڑھی عورت اسے جلتے جلتے بھی گالی دینے سے نہیں چوکی۔ اس نے سٹ پٹا کر دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹ لیا۔ اور سوچنے لگا۔ اس عورت کو اسے محبتی کہنے کا کیا حق حاصل تھا۔ آگے ہی وہ محبت کے ہاتھوں کیا کم ستم اٹھا رہا تھا کہ یہ عورت اب محبت کی پھٹکار اس کے چہرہ پر ثبت کر دینا چاہتی ہے اور اسے اس انسان کے خلاف اپنے دل میں سخت ترین جذبۂ عناد محسوس ہوا۔ جس نے کہا تھا کہ محبت بہشت کی عظیم ترین نعمت ہے وہ سوچنے لگا۔ یہی اگر بہشت کی عظیم ترین نعمت ہے تو ایسی بہشت کو بھی دور ہی سے نمسکار۔ وہ اس نعمت سے اب سیر ہو چکا ہے۔ اور معاً اُسے خیال آیا۔ وہ سیر کہاں ہو چکا ہے وہ تو ابھی جوں کا توں بھوکا ہے۔ اور شاید اب آگے سے بھی زیادہ محبت کی جنت میں داخل ہو کر بھی وہ فیض اٹھانے سے قاصر رہا ہے۔ شاید اسی بدقسمتی نے اُسے بوکھلا دیا ہے۔

اس کی تشنگی بھڑک کر مایوسی کی رنگت اختیار کر چکی ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں سب سے زیادہ بدقسمت انسان ہے۔ ورنہ یوں تین تین مہ پاروں کی ماہیت میں رہ کر بھی وہ کیوں اپنے دل کو ضیائے محبت سے جگمگانے سے قاصر رہا ہے۔ اور پھر اُسے اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ ارے بزدل تو پراگ (ہندوؤں کا ایک متبرک مقام جہاں گنگا، جمنا اور سرسوتی تین ندیاں ملتی ہیں) جا کر بھی پیاسا لوٹا۔ تجھ سے تربینی (جہاں تین ندیاں ملیں) پر بھی اپنی پیاس نہ بجھائی گئی۔ بہتی گنگا سے دو چلو پانی بھی نہ بھر سکا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ سورج کی تپتی ہوئی کرنیں اس پر پھٹکار برسا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ او بزدل! جنت میں تین تین حوریں پا کر بھی تو مایوس واپس لوٹ رہا ہے۔ تو ہے ہی دوزخی اور اسی قابل ہے کہ دوزخ کی آگ میں جلتا رہے۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ سورج کی کرنوں نے جہنم کی آگ سے تپش حاصل کر لی ہے۔ اور عنقریب ہی اب وہ اُسے پھونک کر رکھ دیں گی۔ اس نے گھبرا کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ دمنتی کا ریشمی رومال اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر سمتری کا نیپ کن بھی نکال لیا اور خیال کرنے لگا یہی اس کی محبت کا ماحصل ہیں۔ یہی اس کی الفت کی یادگاریں ہیں اور معاً اسے اپنے میز کی دراز یاد آئی کہ جسے وہ ہر وقت مقفل رکھتا تھا۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ وہ میز کے قریب کرسی پر دراز کھولے تنہا بیٹھا ہے اور ایک ایک کر کے اس سے جملہ اشیا نکال رہا ہے۔ سرجیت کا وہ چاکلیٹوں کا خالی ڈبہ۔ وہ چھوٹی بڑی سوئیوں کا ٹوٹا ہوا ریکارڈ۔ ارملا کی تصویروں والی کتاب۔ شکنتلا کے کئی ایک رومال۔ ناہید کا فوٹو۔ سمرنا کا ہیرپن اور خطوط۔ اس نے خیال کیا۔ اب اس کی محبت کی کائنات میں دمنتی کے رومال اور سمتری کے نیپ کن اضافہ ہو جائیگا

اور بس۔ اُسے اپنے سینہ سے ایک ہوک سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ معاً اسے غالبؔ کا وہ شعر یاد آیا۔

چند تصاویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اور اس نے خیال کیا۔ کیا اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ نہیں نہیں نہیں اسکی محبت کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یوں خار دار نہیں رہ سکتا۔ اور اس نے نگاہیں اٹھا کر اپنے سارا ستہ پر ڈالیں۔ اس نے دیکھا وہ گھاٹ کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس دن کی طوفانی گھاٹ اب صرف چند گزوں میں بہ رہی تھی سرندر نے خیال کیا۔ اس کی ولولہ انگیز آرزوؤں کی طرح اب بھی یہ پائمال ہو چکی ہے

"تتمہ"

سرندر ان دنوں کچھ اُداس اور مضمحل سا ہے لیکن ممکن ہے اسکی زندگی ایک بار پھر پلٹا کھائے۔ اور ہم قارئین کو ایک ایسی ہی اور شاید اس سے بھی رنگین داستان پیش کر سکیں۔ فی الحال آپ بھی میرے ساتھ دعا کیجئے کہ وہ بہت جلد گزشتہ واقعات کی تلخیوں کو فراموش کر کے آمدہ واقعات کی مسرتوں سے کھل کھیلے۔

پروینؔ

دہلی
۱۱ر جنوری ۱۹۴۵ء

اختر حسین
ناشر